اِس بازار میں

ن ج ۔ گ صاحبہ کے مکاتیب کا مجموعہ

ثاقب (زیدی)

اُردو اکیڈمی ۔ لاہور

بار اول

قیمت ایک روپیہ

استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر اردو اکیڈمی بیرون لوہاری گیٹ لاہور سے شائع کیا :-

پیش لفظ

اُن ہنگامہ خیز جراحتوں کے کرب سے بلبلا کر جن کی کراہ اب

اخباروں کے کالموں میں بھی صاف سنائی دینے لگی ہے

اوچھی تہذیب کے ناسُوروں سے رِستے ہوئے اُس لاوے

سے خوف کھا کر جو کوئی دن میں ملک وملت کے اجتماعی اخلاق و دیانت

کو اپنی لپیٹ میں لیا ہی چاہتا ہے۔

اور ـــــ

اُس شعور سے متاثر ہو کر جو بیدار ہو کر کسی معاشرہ کو یہ تمیز سکھا

دیتا ہے کہ آج دُنیا کے اِس بازار میں ہر چیز جو خرید یا فروخت کی جا

رہی ہے۔ وہ درحقیقت اس غرض کے لئے پیدا نہیں کی گئی تھی۔

ثاقب (زیروی)

مدیر ہفتہ وار "لاہور" ـــ لاہور

انتساب

- ز۔ ج۔ گ صاحب کے معلومات بھرے اشارے۔ کنائے
اور مختصر نوٹ
- آپ کے روزمرّہ کے معمولات و مشاغل
- میرا قلم اور محترم خلیفہ محمد افتخار اللہ کے اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک
پہنچانے کے لئے حوصلہ افزا ادبی تقاضے

درحقیقت یہ تینوں چیزیں

"اس بازار میں" کی ترتیب و تکمیل کی ضامن ہیں
اور میں انہی تینوں کے نام مکاتیب کے اس محتاج نظر خرابہ
کو منسوب کرتا ہوں۔

ثاقب (زیدی)

عصمت کی تجارت ہوتی ہے ایمان کے قحبہ خانوں میں

اخلاق کے سودے چکتے ہیں تقدس کے بادہ خانوں میں

ماحول کی نیت ٹھیک نہیں ماحول سے بھی ٹکراتا جا

اس موڑ کے آگے منزل ہے بے باک ترانے گاتا جا

ثاقب زیروی

ملک کی بد قسمتی۔ حکومت کی بے نیازی۔
معاشرہ کی بے راہ روی۔ یا آپ لوگوں کی
بے پرواہی کہ آپ جس شے کو لائسنس
یافتہ کوٹھوں۔ چوباروں اور ڈیروں میں
تلاش کرتے رہے وہ موجود تھی۔
اونچے مکانوں میں۔ بلند بانگ محلوں کے
چھجّوں تلے۔ ہسپتالوں کی جدولوں میں
لیبارٹریوں کے باتھ روموں میں۔
بندر۔ فریئر۔ مال۔ اور میکلوڈ کے
فٹ پاتھوں پر۔ سینما کے بکسوں
میں۔ پارکوں کے بنچوں۔ ایمان کے
قحبہ خانوں میں اور ———— اور
عدل و انصاف کے زیرِ سایہ۔

پہلا خط

اگلے دن میرے گانے کے ایک دلدادہ رات کو گیارہ بجے پولیس کا سائرن سنتے ہی جاتے وقت دانستہ میرے کمرے میں "شورش کاشمیری" کی کتاب "اُس بازار میں" بھول گئے ہیں یہ کتاب اس سے پہلے پڑھ چکی تھی۔ لہٰذا جب انہوں نے کنکھیوں سے کتاب پر ایک آخری نگاہ ڈالی۔ اور آنکھوں میں بے نیازی اور خمار کے ڈورے پیدا کر کے اُٹھتے ہوئے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں اس وقت صرف تمہاری مست لے کی دُھن کے نشہ میں سرشار ہوں اور مجھے کچھ یاد نہیں کہ اپنے ساتھ کیا کیا لایا تھا۔ اور کیا کچھ چھوڑے جا رہا ہوں تو مجھے ان کی نیّت کے اتار چڑھاؤ تک سمجھ میں آ گئے کہ

- وہ یہ کتاب کیوں لائے تھے؟
- اُسے اس طرح رکھ کر کیوں بیٹھے رہے؟ کہ میری اُس کے سرورق پر نگاہ دوڑے اور میں شوقِ مطالعہ کے لئے ان سے مانگنے کی

جرأت کر دی؟

اور اب وہ اُسے جان بوجھ کر کیوں چھوڑے جا رہے ہیں؟ بلکہ ——

غالبؔ کے اس مصرع کے مصداق کہ ع

میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مجھ پر تو وہ تمام گفتگو اور تجاہلِ عارفانہ کی ساری فقرہ بازی بھی منکشف ہو گئی۔ جو وہ اگلے دن یا اس سے اگلی رات کو آ کر فرمانے والے تھے۔

یہ کتاب کیوں لکھی گئی۔ کس کی تحریک خاص پہ لکھی گئی۔ کن کن کتب کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی۔ مصنف اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ایک ادیب اپنی تحریر میں خطیبانہ چٹخارے سمو کر اپنے قارئین کے ذوق مطالعہ کو کہاں تک لذیذ بنا سکا ہیں اس کے متعلق کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی۔

اوّل :۔ اس لئے کہ میں اِس کی اہل نہیں

دوم :۔ میرا علم اور میری تحقیقی صلاحیتیں بہت محدود ہیں۔

سوم :۔ میں کسی کی نیت پر شک کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔ جب کہ خود ایک ایسے طبقہ سے منسلک ہوں جس کی نیت پر ازل سے لے کر آج تک اتنا شک کیا جا چکا ہے کہ اب اُسے کسی دوسرے پر شک کو نیکی

جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔

لیکن میرا خیال ہے اور میں چاہتی ہوں کہ یہ کتاب خوب بکے اوّل اس لئے کہ اس میں ہمارے معاشرے کے ایک طبقہ کے ذہنوں کے قریب بیٹھ کر گفتگو کی گئی ہے، اور دوسرے اس لئے کہ ہمارا متوسّط طبقہ اس کوچہ کے رموز سے فی الواقعہ نا آشنا تھا۔ وہ اپنی ازلی عادات سے مجبور ہو کر ان تلخ حقائق سے متاثر ہو ــــ اور اس بازار کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے یا نہ اٹھائے! لیکن اس کی معلومات میں ایک بیش قیمت اضافہ تو ضرور ہو گا اور اتنے تھوڑے سے پیسوں میں اتنا بڑا اضافہ ــــ اضافہ برائے اضافہ بھی کیا بُرا ہے۔

لیکن میں "لاہور" کی وساطت سے جنابِ مصنّف سے اتنی التجا ضرور کروں گی کہ اگر اس کتاب کی اشاعت سے اُن کا پانچ فی صدی مقصد بھی اقتصادی نفع اندوزی تھا۔ تو وہ اس سے بہت بڑا ایک اور "بازار" بھول گئے۔ ایک بہت چلتا ہوا بازار۔ جس کے دھوم دھڑکے اور ریل پیل کا جواب نہیں وہ بازار کیا ہے؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس کی نشان دہی میں کئے دیتی ہوں۔ لکھئے آپ؟.. آپ!! لیکن یاد رہے کہ اِس بازار میں ــــ (جہاں بیٹھی میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں) ــــ اور اُس بازار میں جس کے مجمل

کوائف لکھنے کے ارادہ سے بیٹھی ہوں، جنس کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں ہیں "باسی کوشت اور لفظی عصمت" ہی فروخت ہوتے ہیں البتہ دکانیں —— کاؤنٹر —— انداز خرید و فروخت —— ایجنٹ —— خریدار —— سودا بازی کے مقامات —— بکری —— اور بازار کے کاروباری مدّوجزر کے اُمور میں نمایاں اختلاف ہے ——
مثال کے طور پر:

"یہاں تو باقاعدہ کمرے ہیں، چبوترے ہیں۔ کوٹھیاں ہیں، چوبارے ہیں، مکان ہیں۔ دکانیں ہیں منتشر اور متوزع آبادی سے کٹا ہوا ایک محلّہ ہے۔ یہاں صرف راتیں بیدار ہوتی ہیں۔ لیکن راتیں بھی اب کہاں بیدار ہوتی ہیں شاید حفظانِ صحت کے اصول کے تحت اب تو اس بازار کے ہر مکین کو بھی گیارہ بجے رات اپنے کواڑ بند کر لینے پڑتے ہیں پولیس کی اجازت سے بلیک مارکیٹ اور بات ہے یا پھر یہ ہے کہ جنگلے اور دیواریں پھاند کر یہاں سے دوسرے بازار کے صحن میں چھلانگ لگا دی جائے"۔

لیکن اُس بازار کا رقبہ خدا کے فضل سے اتنا محدود نہیں۔ اس کے چند

چند گنے چُنے تھڑے اور دُکانیں نہیں ہیں بلکہ اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ ہر شہر کے بیشتر گھر بیٹھکیں۔ پارکیں، کلبیں، سیرگاہیں ہوٹل اور کیفیاں اس کی دُکانیں ہیں اور جو باقی ابھی تک اس کاروبار سے آگاہ نہیں ہیں۔ وہ میرے خیال میں ابھی آداب شہریت سے کاملاً آشنا نہیں ہونے پائے۔

میرے بازار کے کاروباری دلّال اور ایجنٹ بڑی بڑی مونچھوں اور اُبھرے ہوئے شانوں والے مُشٹنڈے تو اب دُور سے پہچانے جا سکتے ہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ سبحان اللہ اُن کے رکھ رکھاؤ کا کیا کہنا۔ ان کی پردہ پوشی تو نفیس سُوٹوں، بھڑکیلی ٹائیوں، لچکتی ہوئی اچکنوں، اور اُلجھی ہوئی ڈاڑھیوں نے کچھ اِس انداز سے کر رکھی ہے۔ اور اُنہیں معاشرے کے ہر موڑ پر اور تقاضا و تحقیق کی ہر مجلس میں تقیّہ کر لینے کا کچھ ایسا ازلی حق عطا ہو چکا ہے کہ اُن کو پہچان لینے کے باوجود اپنی پہچان پر ایمان لے آنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

اُن کی بیک وقت خدا اور گورنمنٹ ہاؤس تک رسائی ہے:

اُن کی ہیک وقت بٹھانے اور عدالت تک پہنچ ہے۔

اُن کا بیک وقت خطیب اور صحافی سے یارانہ ہے اور اُن کی کھنکتی ہوئی جیب بڑے بڑے موشگافوں کا مُنہ بند کر دینے پر قادر ہے۔

اِس بازار میں، آنے کے لئے چند آداب کی واقفیت لازمی ہے۔ ورنہ یہ جنس مشکل ترین ہو جاتی ہے۔ یہاں کے جراثیم نہ جلد چمٹتے ہیں اور نہ جلد جسم سے جدا ہوتے ہیں لیکن اُس بازار میں کسی خوف، جھجک اور آداب و مراسم کی ضرورت نہیں وہاں یہ جنس نہایت سہل الحصول ہے۔

سر راہ سودا ہو جاتا ہے۔ اور راہ چلتے فراغت ——— جتنے دام اتنا کام اور بس!!

اور مجھے تسلیم ہو کہ بیشتر یہ کاروبار ہماری نسبت سستا پڑتا ہے یہاں کا کوئی ہدیہ پیش کرنا پڑتا ہے دونوں اکثر گھر سے کھا کر آتے ہیں۔ نہ گانا سننا پڑتا ہے۔ راستوں اور چوراستوں میں نصب گلا پھاڑتے ہوئے ریڈیو سُن سُن کر دونوں کے کان پک چکے ہوتے ہیں۔ بس کچھ پیشگی اور کچھ واپسی ——— اور کچھ جنس کی واپسی کے وقت کا تعین اور بس! کوئی رقابت نہیں۔ کوئی خدشہ نہیں اِس کے بعد دونوں سوسائٹی کی نظر میں اُتنے ہی پاکیزہ و بلند ہو جاتے ہیں جتنے اِس سے پہلے تھے۔

مجھے یاد آگیا جب میں نے پہلے پہل ــ "اس بازار میں" قدم رکھا تو مجھے اپنے قصبے کے ایک چودھری کے بیٹے سے محبت تھی ـ آپ گھبرائیے گا نہیں۔ میں نے لفظِ "محبت" اس کا مطلب و مفہوم خوب سمجھتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے پہ دل و جان سے فدا تھے کیا آپ باور کر سکتے ہیں۔ کہ

"محبت کی ابتدائی شدتوں اور ایک سال کی چوری ملاقاتوں کے باوجود ہم اپنے جسموں پہ حاوی رہے اور اس کی شکست کو کسی نیک اور بابرکت ساعت کے لئے اٹھائے رکھا"

لیکن جب اس لگن کی حدت اور اس لاگ کی آگ شعلوں بھڑکنے لگی۔ تو میں نے ایک دن اپنے سہیلیوں سے آنکھ بچا کر اپنے دل پسند سسرال جانے کی ٹھان لی ـ میرے وطن کا وہ شریف گھرانہ میرے ماحول سے اتنا ہی بے خبر تھا۔ جتنا ــ "اس بازار میں" ــ کا مصنف اب اس بازار سے باخبر ہے لہذا جب میں شریف زادیوں کی طرح برقعہ اوڑھ کر اپنے محبوب کی والدہ سے ملنے گئی۔ تو کسی نے پہلی نظر میں ناک بھوں سکیڑنے کی بدعت اختیار نہ کی ۔ اُن کی امی ایک نہایت پاکیزہ اور عبادت گزار خاتون تھیں جنہیں نے ــ جب سب

چلے گئے اور انہوں نے مجھ سے عرض مطلب کے لئے کہا تو ہزار معذرت کے بعد ساری داستان کہہ سنائی۔ میری جھولی میں اس وقت بیس ہزار کے زیور — میرے دونوں مکانوں کی رجسٹریاں (جن میں سے ایک دہلی میں اور ایک آگرہ میں تھا) اور تین چیک بکیں تھیں (جن کی رو سے میرا کوئی تیرہ ہزار روپیہ تین مختلف بنکوں میں جمع تھا۔)

میں نے کہا:۔

کہا جاتا ہے کہ ایک گانے والی کو پیسے ہی سے اُلفت ہوتی ہے۔ لیکن میرے معاملے میں یہ سچ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی یہ تمام جائداد۔ لے کر آپ کے پاس حاضر آگئی ہوں یہ بطورِ کفالت رکھ کر میری میرے محبوب سے منگنی کر دیجئے۔ اگر میرے نفس کی حرامزدگیاں جاگ اٹھیں اور میں نے چوبارے میں بیٹھ کر پھر ایک دفعہ بدرو کی طرف جھانکنے کی جرأت کی تو میرا سب کچھ ضبط۔ مجھے صرف ایک مرد — ایک انسان اور ایک روح اس گناہ کی وادی سے نکال سکتی ہے۔ اور وہ ہے ——

آپ کا بیٹا! اللہ! مجھے اس سے وابستہ کر دیجئے۔ میں تمام عمر آپ کی اور اُن کی کنیزوں کی طرح خدمت کروں گی۔"

میرے آنسو اور میرا ایک جذبہ اُس وقت اُس شریف خاتون کو کوئی جواب نہ سمجھا سکا۔ اور اُس نے میری تمام اشیاء رکھ کر مجھے ہمدردانہ غور کا دلاسا دے کر لوٹا دیا لیکن اس سے اگلی جمعرات کو اُن کے حرم کی ایک بوڑھی کنیز ہمارے ہاں پہنچی جس نے الگ لے جا کر مجھے میری تمام اشیاء معہ ایک سو روپے کے اضافہ سے لوٹا دیں۔ یہ کہہ کر کہ

"بیٹی! میں جیتے جی اپنے اِس کنبہ کا مُنہ تو بند رکھ سکتی ہوں۔ لیکن تم دونوں کی آئندہ نسل پر جو انگلیاں اٹھیں گی۔ اور معاشرہ کی موشگافیوں سے تنگ آ کر تم دونوں جھنجلا جھنجلا کر جو ایک دوسرے کے گریبان گیر ہو گے۔ اس روحانی عذاب کے تصوّر سے بھی میری روح کانپتی ہے۔"

لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میری بجائے اُس بازار کی کوئی خاتون اس سے نصف ساز و سامان کے ساتھ اُن کے ہاں پہنچ جاتی۔ تو اس نیک ماں کا ماتھا شکرانے کے نفل پڑھتے پڑھتے گھس جاتا۔ خواہ اُس کے بیٹے کی ساری زندگی جہنم بن جاتی۔

اُف! جذبات کی رو میں ــــ میں کہاں سے کہاں نکل آئی ــــ تو میں

ان دونوں بازاروں کا موازنہ کر رہی تھی یقین مانئے

اس بازار کی ہر بی بی - بیٹی - بہو اور ماں شریف ہے - شریف رہتی ہے اور شریف رہے گی - ہماری طرح اپنی جنس نقد یا ادھار ہم سے بھی کہیں زیادہ اونے پونے بیچنے کے باوصف!

آپ کسی ہوٹل میں ٹھہریئے - قالین - کرسی - صابن تولیہ سجانے کے بعد اس کا فریج کمٹ بیرا خود ہی دریافت کرے گا ---- اور حضور رات کو؟ ----

اگر آپ اناڑی نہیں - اور آپ نے کچھ تخصیص چاہی تو وہ ایک مطبخ کے بیرے کی طرح سارے کا سارا مینیو سنا دے گا -

کالج گرل نرس - استانی - فلم کی شوقین سلیقہ شعار بالکل گھریلو میٹرک پاس اور علیٰ ہذالقیاس! اور مزہ تو یہ ہے کہ گھر کو بازار بنا لینے - گھر سے بازار یا ہوٹل چلے آنے کے بعد اس خاتون محترم کے معاشرے کے مقام میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا -

اگر ذرا عمیق نظر سے مطالعہ فرمایئے گا تو فن اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے کچھ اور بھی واضح فرق ہیں مثلاً ہمارے ہاں تو یہ بدعت ہے نہ اکہ سوسائٹی کے خیال کے مطابق یہاں نہ کوئی اخلاقی قدر موجود ہے اور نہ عصمت و

عفت ہی کا کوئی مقام رہ گیا ہے لیکن قربان جاؤں اُس بازار کے ـــــ
وہاں کی اخلاقی قدریں اور نظریاتی زاویے اتنے کڑے پختہ اور مستحکم ہیں کہ مجال کیا
اُن پر یہ حادثات ذرہ بھر بھی اثر کرسکیں بلکہ میں نے تو اِس بازار کے خریداروں
اور دُکانداروں میں بہتوں کو اخلاقیات کے موضوع پر مسلسل اور نہ ختم ہونے
والی تقریریں کرتے سُنا ہے۔ ـــ اور میرے نزدیک سب سے بڑا فرق
یہ ہے کہ ہمارے ہاں ـــــ ہمارے اس بازار میں جس کے ایک احاطہ میں بیٹھی
میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہوں ـــــ گناہ ایک مجبوری ہے ۔
ایک معاشی علاج ہے ـــــ بے لذت ہے ـــــ بدذائقہ ہے ـــ
لیکن وہاں ـــــ فن برائے فن ـــــ انتہادرجہ کا لذیذ ـــــ محض
جسمانی یا ذہنی عیاشی ـــــ ایک شوق ـــــ ایک لت ـــــ
"شاید اسی لئے وہ معاشرے کی قیود سے بلند و بالا ہے"۔
ملک کی بدقسمتی۔ حکومت کی بے نیازی۔ معاشرہ کی بے راہ روی۔ یا
آپ لوگوں کی بے پروائی ـــ کہ آپ جس شے کو لائسنس یافتہ کوٹھوں۔
چوباروں اور ڈیروں میں تلاش کرتے رہے ـــــ وہ موجود تھی۔
اونچے مکانوں میں

بلند و بانگ محلوں کے چھجوں تلے

ہسپتالوں کی جدولوں میں

لیبارٹریوں کے باتھ رُوموں میں

بندر۔ فریئر۔ مال اور میکلوڈ کی فٹ پاتھوں پر

سینما کے بکسوں میں

پارکوں کے بنچوں پر

ایمان کے قحبہ خانوں میں

اور عدل و انصاف کے زیر سایہ!

لیکن ہوسکتا ہے کہ آپ صرف لائسنس یافتہ گناہ ہی کے متلاشی رہے

ہوں اور آپ کو سکہ بند جُرم ہی کی جستجو رہی ہو اگر حقیقت یہ ہے تو پھر میری توبہ

——— پھر آپ سچے اور میں جھُوٹی! لیکن میں حکومت سے اتنا ضرور عرض

کروں گی۔ کہ

اگر ہمارے بازاروں کے قیام و بقا میں ایک فی صدی بھی مقصد

حصولِ ٹیکس ہے تو اُس کی اتنی گنا آمد نذرِ تغافل ہو رہی ہے۔ یونہی

سمگل ہو رہی ہے۔ اگر اسی ایک چیز کی بلیک مارکیٹ پر بھی پابندی

لگانے میں وہ کامیاب ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ ملک کے بہت

سے شدید مسائل حل ہو جائیں۔"

لکھنے بیٹھی تھی تو سینکڑوں چُبھتے ہوئے فقرے میرے ذہن میں کلبلا رہے

تھے۔ انکشافات کے جراثیم معلومات کے دفتر لیکن اب اس خیال سے اُن

تمام متفرقات کو ضبط کی سِل کے نیچے دبا کر مکتوب کو بند کر رہی ہوں کہ کل کلاں

کو جب "لاہور" چھپ کر میرے شہر میں آئے گا۔ اور میرے اس مضمون کی

بھنک میرے بازار کے آڑھتیوں کے کانوں تک پہنچے گی۔ وہ مجھے بُری

طرح کوسیں گے۔ مجھے اپنے بازار کی توہین کے الزام میں دھرلیں گے۔ بڑی

بوڑھیاں اپنی اپنی پیڑھیاں لے کر آبیٹھیں گی اور کہنا شروع کر دیں گی۔

"کلمونی! تمہیں کیا بُرا نظر آیا یہاں۔ جو دوسروں کے زرق برق

کی تعریف بھینکنے لگ گئی۔ کُجا ہم اڈے پر بیٹھ کر وار کرنے والی

اور کُجا وہ پھر چل کر تیتنگ لڑانے والی۔ تم ایسا کچھ لکھنے سے پہلے مر

کیوں نہ گئی اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا جائے گا۔"

وہ کسی حالت میں بھی اپنے اوپر احساسِ کہتری وار دنہیں کرنا

چاہتے۔ شاید اس لئے کہ جنس جسم کے کاروبار میں احساسِ کہتری

ہمیشہ آمدنی میں بے انتہا کمی کا باعث ثابت ہوتا ہے۔

میں ہوں۔ ایک گنہگار جسے جھونپڑے
میں بیٹھ کر محلوں پر ـــــ قہقہے لگانے
کا جنون ہے

ز ـ ج ـ گ

(حیدرآباد سندھ)

حاشا! میرا ذرہ بھر اشارہ بھی اُن مریم صفت کنواریوں اور عصمت کے مجسموں کی طرف نہیں جن کے دم سے میرے ملک کی ناموس بلکہ اس کائنات کا وجود قائم ہے جن کے مقدّس دامنوں کی فرشتوں نے قسمیں کھائی ہیں جن کی گود میں پیغمبر کھیلے ہیں جن کے بطنوں سے بڑے بڑے صدّیق، شہید اور صالح پیدا ہوئے ہیں اور جنہوں نے ایسے ایسے مجاہدینِ صف شکن کو جنم دیا ہے کہ اُن کی ذوالفقار کی جھنکار سے قصرِ سطوت و جبروت کے کنگرے لرزلرز گئے ہیں ——

اُف! آپ کس نور کی اوٹ لے کر کن ظلمتوں کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں +

دوسرا خط

مدیرِ محترم! آداب بجا لاتی ہوں حضور! آپ نے یہ (بقول آپ کے) کیا واہ واہ کے ڈونگروں کا پلندہ بھیج دیا۔ کیا میں آپ کو یقین دلانے کی کوشش کروں کہ مجھے میری ساری زندگی میں اتنے تیز اور زہر میں بجھے ہوئے تیر و نشتر کبھی موصول نہیں ہوئے۔ حالانکہ میرا کاروبار ہی روز ایسے ایسے القابات وخطابات سُننا ہے کہ رُوح لرز جائے۔ اوائل شباب میں چھ سات رومان پسند منچلوں کے خطوط روزانہ آیا کرتے تھے عطر میں بسے ہوئے داغ اور میر کے شعروں سے آراستہ و پیراستہ لیکن خطوط کا یہ بے پناہ سیلاب۔ گالیوں کی اس قدر بے تحاشا بوچھاڑ اور پند و نصائح کا یہ لامتناہی سلسلہ نہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔ میری پہلی ساری زندگی کے خط و کتابتی سرمائے میں بھلا یہ رعنائی۔ یہ ادبیت۔ یہ طنز اور یہ زہر کہاں! میں نے بڑی آسانی کے ساتھ آپ کے مرسلہ تحسین و آفرین کے مرقعوں کو چار حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

اوّل:- وہ جنہیں بغیر کسی تکلّف کے صرف "مغلظات" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

دوم:- وہ جن میں میرے اندازِ تحریر کی کچھ اس رنگ و حُسن کے ساتھ تعریف کی گئی ہے کہ ساتھ ساتھ اُن کا اپنا ادبی مقام بھی مجھ پر اثر انداز ہوتا جاتا ہے۔ خدا جانے ان کا اس ادبی مسمریزم سے مقصد کیا ہے۔

سوم:- وہ جن میں محض شرعی گالیاں ہیں۔ خالص عربی میں۔ فصیح و بلیغ گالیاں جن پر پند و نصائح کی سنجیدہ و متین لیکن سیلی سی کھانڈ چپکی ہوئی ہے۔ اور

چہارم:- ان لوگوں کے خطوط کا مجموعہ ہے جنہوں نے میرے مکتوب کو میری بزنس کا اشتہار سمجھا ہے۔ اور انہیں اشتہار کی زبان کچھ ایسی پسند آئی ہے کہ اب وہ مجھ سے ہمدردی ہی کی آڑ میں عشق بازی فرمانے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔

میں آپ کو یقین دلاتی ہوں اگر مجھے انسانیت کی ان جگر خراش کراہوں کا ذرہ بھر بھی تصور رہتا جو بعض بڑے بڑے بلند گھرانوں اور محلوں سے بلند ہوتی ہیں تو میں کبھی بارادہ تفننِ طبع بھی کبھی اس موضوع پر قلم نہ اٹھاتی۔ اُف! اس بلبلاہٹ نے انتقامی روپ دھار کر مجھے کس کس نام سے

کوسا ہے۔

"ملعون۔ مردود۔ جہنمی۔ کسبی۔ اٹھائی گیری اور خدا جانے کیا کیا"۔

اتنے تیز اور نکیلے پتھر۔ ایک ہی بوچھاڑ میں جس غریب پر برسے ہوں گے

اُس بے چارے کا بھرکس ہی تو نکل گیا ہوگا۔ لیکن صد شکر کہ اطمینان حاصل

کرنے اور دل کو تسلی دینے کے لئے میرے پاس ایک حرف تشفی تو

موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

• "میں یہ سب کچھ ہوں تو!

• ایک درخت کو۔ درخت ہی تو کہا ہے اُن لوگوں نے"!!

البتہ مجھے آپ کی ستم ظریفی پر حیرت بھی ہے اور اعتراض بھی اور وہ

ہے آپ کا میرے نام کے پہلے حرفوں سے قبل لفظ "محترمہ" کا اضافہ ــــ

کیا کہنا ــــ "محترمہ کا"! ــــ صرف اس وقت تک جب تک قلم کی حرکت

"م" سے شروع ہو کر "ہ" پر ختم نہ ہو گئی۔ اور اُس سے پہلے اور بعد میں یہی

محترمہ۔ قتالۂ عالم۔ دغا باز۔ بے وفا۔ بے حیا۔ بازاری اور ــــــــ

اور بہت کچھ۔

بندہ نواز! جس طرح ایک شریف خاتون کو رنڈی یا بازاری کہنا بدترین

قسم کی گالی ہے۔ اسی طرح ایک رنڈی یا ویشیا کو بھی مکرّمہ یا محترمہ ایسے
القابات سے یاد فرمانا بھی اسی قسم کی تہمت سے کم نہیں ـــــ میں جو ہوں
مجھے رہنے دیجئے اور اس سے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی سعی ناکام نہ
فرمائیے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ میں اپنے آپ کو آپ سے بہت
زیادہ جانتی ہوں۔ لہٰذا مجھے اس زیب داستان سے معاف رکھئے۔
اور اگر خدانخواستہ آپ نے اصرار کیا تو میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گی کہ آپ
بھی اپنی نیّت میں مخلص نہیں ہیں اور کسی نہ کسی طرح میری تذلیل پر اُترے
ہوئے ہیں۔

ہاں! ـــ تو ان خطوط میں جہاں اور بہت قیمتی قیمتی مشورے درج ہیں۔
وہاں ایک دل پسند چیز یہ بھی ہے کہ لاہور ہی سے ایک صاحب نے مجھے
اپنے مکتوب کا عنوان بلبل دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب
اس مکتوب میں کوائف اُسی بازار کے ہیں جو ہمارے چاروں طرف
پھیلا ہوا ہے، تو پھر اس کا عنوان "اُس بازار میں" کیوں؟ گویا انہوں نے
دیدہ دانستہ میری کسی کوتاہی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"کیونکہ میرا مکتوب تو محض مکتوب تھا۔ اور بس۔ بے معنی۔ بے عنوان
آپ ہی نے اُس پر عنوان جمایا اور آپ ہی نے اُس میں معانی سموئے
لہذا یہ اعتراض بھی آپ ہی وصول فرمائیے"

میرے خیال میں مشورہ معقول بھی ہے۔ اور صائب بھی۔ لہذا اگر کوئی خاص
امر مانع نہ ہو تو اب کے عنوان میں مطلوبہ تبدیلی کر دی جائے۔

دو ایک خط تو تمہید و تشبیب ہی سے ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے
کسی پیٹنٹ قسم کے اسلامی ادیب سے لکھوائے گئے ہوں اُن میں بڑی
بڑی تاویلوں اور تصریحوں کے بعد (ایک ایسی عبارت کی آڑ لے کر جو میرے
فرشتوں کے بھی سمجھ میں نہ آسکے) مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے!
جس کا وجود معاشرے کے ماتھے پر ایک کلنک کے ٹیکے سے زیادہ نہیں)
نعوذ باللہ کسی انتقامی جذبے سے مغلوب ہو کر اہلِ پاکستان کی بعض حرکات پر
زبانِ طعن دراز کرنے کی جرأت کی ہے اور ان میں کیڑے نکالنے کی گستاخی کی
ہے اور بڑے مزے لے لے کر قوم کی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں پر گند اُچھالا
ہے!

اس کے جواب میں —— میں —— (جس کی تعریف اوپر آچکی ہے)

اس کے سوا کیا عرض کر سکتی ہوں کہ

"اے کاش وہ حضرت مولانا اُس کرب کا اندازہ کر سکتے۔ جس سے

میں وہ الفاظ سپردِ قلم کرتے وقت دوچار تھی"۔

اُن کی معلومات میں اضافہ کے لئے عرض کروں کہ میں اپنے زمرہ میں

باغی منصور ہوتی ہوں۔ اور مجھ پہ تہمت یہ ہے کہ

"جس روزگار کے ذریعے میرا خدا مجھے پیٹ بھر کر کھانے کو دیتا

ہے۔ میں ہر وقت اُسی کا بُرا چاہتی ہوں"۔

میں مانتی ہوں۔ کوئی احسان شناس ضمیر بھی ایسا کرنا گوارا نہیں کرے

گا لیکن اِسس زندہ احساس کے باوصف میں پھر ایسا کیوں کرتی ہوں اس

کا میرے پاس کوئی جواب موجود نہیں۔ سوائے اس کے کہ

"مجھے اس کاروبار سے طبعی نفرت ہے"۔

شاید یہی وجہ ہے کہ لاشعوری یا نیم شعوری طور پہ مجھے جب بھی

کوئی ان تعفن کے گڑھوں کی طرف بڑھتا ہُوا نظر آتا ہے۔ خواہ اُس نے

تہذیب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔ یا سوسائٹی کا دل فریب رُوپ دھار

رکھا ہو۔ میری روح فوراً بلبلا اُٹھتی ہے۔ اور میں دیوانہ وار کہہ

اٹھتی ہوں ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

اسی مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ انداز فکر صرف میرا ہی انداز فکر ہے۔ میرے نزدیک عصمت فروشی خواہ بندر اور فریئر روڈ پر کرائی جائے یا کسی خاص کوٹھے اور ڈیرے میں۔ وہ بہر حال عصمت فروشی ہی ہے۔ چوری خواہ مسجد میں کی جائے، یا بت خانے میں اُسے ہر حالت میں چوری ہی کہا جائے گا۔

"اور ایسا کرنے والے کو بلا تعین زمان و مکان اور بلا لحاظ وجاہت و مرتبت ہمیں زناکار اور چور ہی کہنا ہو گا"

باقی رہی یہ بات کہ آپ معاشرے کے ایسے ایسے سنگین جرائم کی اصلاح کی بجائے آنکھ لحاظ اور چشم پوشی سے کام لینا چاہتے ہیں تو یہ مکر وحیل کا شرعی اغماض آپ کو مبارک۔ میرا ظرف اتنا وسیع نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے جب اِن امور کو کریدا تو مقصد کسی کے زخموں کو چھیڑنا نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسی ہی چھیڑ خانی تھی جو عموماً ہم جلسوں اور ہم صحبتوں میں مزا دے گا ہے

ہو ہی جایا کرتی ہے۔

اب آپ کی تشفیِ کامل کے لئے تیسرا الزامی جواب عرض کرتی ہوں سنئے!

بندہ نواز! در اصل میں نے تو یہ ذکر محض اپنا بزنس چمکانے کے لئے چھیڑا

تھا۔ اگر آپ بزنس مین ہیں (اور آج کل کون بزنس مین نہیں) تو پھر آپ یہ

بخوبی جانتے ہوں گے کہ بزنس کی خاطر پڑوسیوں، ہمسایوں۔ ہمعصروں

اور ہم چشموں سے مقابلے کی نوبت آہی جایا کرتی ہے تا کہ

گاہک کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکے۔

سونے اور رولڈ گولڈ میں فرق جان سکے

اور در حقیقت میرا کہنے کا مقصد یہی تھا۔

کہ اے خریدارانِ حُسن و عصمت!

اگر محض سودا بازی ہی منظور ہے تو سیدھے ان مخصوص چبوتروں

اور تھڑوں کی طرف چلے آئیے ——— کیونکہ ——— یہ محض کافروں

کے ڈیرے ہیں!

اور وہ جو چلتے پھرتے خیمے نظر آ رہے ہیں۔ اُن میں چھُپ کر وار

کرنے والے تو کافر بھی ہیں اور منافق بھی

" دیکھو! اچھے گاہک کبھی بڑی دکانوں پر ریڑھیوں اور کھوکھے والوں کو ترجیح نہیں دیا کرتے"

آخر ہم خاندانی بزنس مین ہیں۔ ہمیں اس کاروبار کے رکھ رکھاؤ کا کچھ پاس بھی ہے۔ اگر اس انسانیت سوز سودے بازی میں کچھ وفا ہو سکتی ہے تو وہ آپ کو محض ہمارے ہی چوباروں میں مل سکتی ہے۔ آپ ہی غور فرمائیں۔

بھلا سیلانیوں صحرانوردوں اور جہاں گشتوں کا کیا اعتبار۔ کوئی عجب نہیں۔ تہذیب اور معاشرے کے وقار کا احساس انہیں کب بستر بدلنے پر مجبور کر دے۔ اور کب آپ کی تمام تفریح عذاب میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔

مجھے یقین ہے —— آپ یہ پڑھ کر ضرور ہنسے ہوں گے اور آپ کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ہوگا

"اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال"

وفا اور اعتماد ایک رنڈی میں۔ سوسائٹی کی دوسری لائقِ صد احترام خواتین کے مقابلے میں بھی؟

اور لیجئے۔ میں اس کے جواب میں بڑے دھڑلے کے ساتھ کہتی

ہوں ——— ہاں ——— !

لیکن یاد رہے۔ صرف اُن خواتین کے مقابلہ میں جن کا ذکر میں نے اپنے پہلے مکتوب میں کنایتہً یا صراحتہً کیا ہے۔

"حاشا! میرا ذرّہ بھر اشارہ بھی اُن مریم صفت کنواریوں اور عصمت کے مجسموں کی طرف نہیں۔ جن کے دم سے میرے ملک کی ناموس بلکہ اس کائنات کا وجود قائم ہے۔ جن کے مقدس دامنوں کی فرشتوں نے بارہا قسمیں کھائی ہیں جن کی گود میں پیغمبر کھیلے ہیں۔ جن کے بطنوں سے بڑے بڑے صدیق، شہید اور صالح پیدا ہوئے ہیں۔ اور جنہوں نے ایسے ایسے مجاہدین صف شکن کو جنم دیا ہے کہ اُن کی ذوالفقار کی جھنکار سے قصر سطوت و جبروت کے کنگرے لرزہ لرزہ گئے ہیں۔ اُف! آپ کس نور کی اوٹ لیکر کن ظلمتوں کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں؟"

مثال کے طور پر میں آپ کو ایک سچا واقعہ سناتی ہوں، یہ واقعہ میری زندگی کا نہیں۔ مبادا آپ چیخ اُٹھیں کہ میرا مقصد شاید اپنی زندگی کے اوراق کی تشہیر کرنا ہے۔ بلکہ یہ واقعہ میرے ایک وارفتہ و متوالا موسوم "بہ شاہ صاحب" کا ہے۔ وہ میری دہلیز سے پہلے اس سے بھی بڑھیا ایک چوکھٹ پر جبیں سائی

فرما چکے ہیں۔ اور وہاں سے کچھ ایسے "موڈ" لے کر آئے ہیں کہ اب اُنہیں ان چار دیواریوں کے علاوہ کہیں اطمینان ہی نہیں ملتا۔ میں نے جو ایک دن بڑے محبوبانہ انداز سے اصرار کیا تو وہ پھوٹ پڑے اور انہوں نے اپنے غم کی داستان یُوں بیان کرنا شروع کی۔

"۔ ۔ ۔ ۔ شروع جوانی ہی میں کہ ابھی شباب طفلی کے مدرسے سے نکل ہی رہا تھا۔ مجھے ایک کسبی کی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ ہم جب بھی ملتے میں اپنے گھر کے نیک ماحول اور وہ اپنے ماحول کی ظلمتوں کا تذکرہ کرتی۔ حتیٰ کہ ہم نے فیصلہ کیا کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد دونوں کوشش کریں گے کہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں اور اپنے گھر میں ایک مثالی قسم کی جنت پیدا کریں۔ لیکن ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

کے مصداق جونہی میں نے امتحان میں باعزاز کامیاب ہونے کے بعد اپنی اور شہانہ کی شادی کے لئے اپنے گھر میں سلسلہ جنبانی کی۔

بڑے بڑے مستحکم ستون لرز گئے اور بڑی بڑی مہربان آنکھیں انگارے برسانے لگیں؛

میں نے اس صورت حال کی خبر شہانہ کو دی۔ تو وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح تلملا اُٹھی۔

"ہم ان لوگوں کی پروا نہیں کریں گے۔ میں اپنے ساتھ اپنے کنبہ کا زیور اور کپڑے لتے لے چلنے کو تیار ہوں۔ آؤ اِن بے رحم نظروں سے کہیں روپوش ہو جائیں۔ جہاں مجھے یہ عصمت کے تاجر، یہ حُسن کے بیوپاری اور یہ ناموس کے سوداگر ڈھونڈ نہ سکیں۔ جیدرا جس طرح بھی ہو سکے مجھے اس جہنم سے نکال لو۔"

لیکن میں شاید بزدل تھا۔ کہ اپنی ضمیر کی آواز کا ساتھ نہ دے سکا۔ محض چند سُرخ سُرخ آنکھوں سے ڈر کر اُسے زندگی بھر کے جہنم سے نجات نہ دلا سکا۔ اور اس سے جھوٹ مُوٹ وعدے کر کے مرتبوں پر چلا گیا۔

شہانہ جوان تھی۔ انٹرنس پاس کر چکی تھی۔ اس لئے میرے دیکھتے ہی دیکھتے مارکیٹ میں اُس کا بھاؤ چڑھنے لگا۔ بعض فلم پروڈیوسروں نے تو سرفرازی کی فیس کے علاوہ فلم کنٹریکٹ دینے کی رشوت بھی پیش کی۔ لیکن شہانہ ملول رہتی تھی۔ اور وہ جب تک بالکل صحت مند نہ ہو جاتی ۔۔۔ کاروبار کا کامیاب افتتاح ناممکن تھا۔ لہٰذا اُسے میرے

ماحول سے اوجھل کرنے کے لئے دہلی لے جایا گیا۔ پھر دو چار ماہ
زرق برق ساڑھیوں اور نفیس وبھڑکیلے زیورات کی صحبت میں
رکھا گیا۔ اور جب اس کی طبیعت ذرا سنبھل گئی تو عصمت کو
کاروبار کی سان پر چڑھا دیا گیا"

گویا وہ شہانہ جو ایک پاکیزہ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ وہ شہانہ جو میرے
گھر کی ملکہ بن کر زندگی کی تمام خزاؤں کو بہاروں سے بدل دینے کا عزم کر
چکی تھی جو میری اور صرف میری ہو کر ہی زندہ رہنا چاہتی تھی —— اُس
شہانہ کو

قوم بلکہ ملک کی ملکیت بنا دیا گیا۔

شہانہ کا کاروبار دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اُس کی شہرت دہلی
سے آگرہ تک پہنچ گئی اور یہ ذکر ایک نہایت ہی حسین چاندنی رات کا ہے
ہم چند زائرین قسم کے لوگ بیٹھے تاج کی لافانیت پر تبصرے کر رہے
تھے کہ باتوں باتوں ہی میں رقص و رنگ کا موضوع چھڑ گیا اور پھر۔ ع

بات پہنچی تری جوانی تک

گویا ایک دہلوی تاجر نے شہانہ کی ناچ تھرک کو سراہنا شروع کر دیا۔

- وہ یُوں قدم اُٹھاتی ہے
- وہ یُوں گفتگو کرتی ہے
- اُس کی ہر ادا میں سلجھاؤ ہے
- وہ دلوں پر حکومت کرنے کا ملکہ رکھتی ہے

اور ــــــ اور ــــــ چلو جانے دو

میں نے بے تاب ہو کر پوچھا ــــ اور کیا؟ ــــ کہتے چلے جاؤ کتنا پیارا ذکر چھیڑا ہے یار تُم نے

"اور معلوم ہوتا ہے (اُس نے کہنا شروع کیا)
وہ پہلی زندگی میں کسی سے عشق بھی کر چکی ہے"

"تمہیں کیسے معلوم ہُوا!" میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا

میں نے ایک دفعہ باصرار دریافت کرنے کی جرأت کی تھی تو وہ جواباً محض "رو" دی تھی۔

مجھے تو جیسے کسی نے یکدم پہاڑ کی چوٹی سے دھکا دے دیا ہو۔ میری تمام کوتاہیاں میری تمام لغزشیں۔ ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگیں۔

"—— وہ ابھی تک میری یاد کو دل میں سموئے ہوئے ہے"۔

اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ میں چپکے سے اُٹھ کر اسٹیشن پر آ گیا۔ اور پھر دہلی پہنچ کر ہی دم لیا۔ سارا دن دیوانہ وار اِدھر اُدھر پاگلوں کی طرح گھومنے کے بعد دوپہر کے قریب کہیں اُس کا کوٹھا مِلا۔ شہانہ اس وقت اپنے خاص عشاق کے جُھرمٹ میں جلوہ فرما تھی۔ مجھے اچانک سامنے سے دیکھا تو اُس کی نس نس میں یوں زندگی دوڑ گئی جیسے کسی نیم مُردہ جسم میں کسی جوان خون کے داخل کرنے سے سُرخی لہرا جائے —— میں وہاں کوئی چار دن رہا۔ اُس کے دروازے بند رہے۔ اُس نے اس قیام میں میرے پاؤں تک دھو کر پینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن میں نے چاروں دن اِس بات کا اندازہ کیا کہ

- وہ دانستہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے سے گریز کرتی ہے۔
- وہ عمداً اپنے پانی کے گلاس کو مجھ تک نہیں آنے دیتی۔
- اور —— وہ ارادۃً اپنی نازک پتیوں کو میرے ہونٹوں سے دور رکھتی ہے۔

آخری دن تو جب مجھ سے ضبط نہ ہی ہو سکا میں نے کہا ——

شہانہ! تم نے تو ساری زندگی میری ہونے اور میری رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر یہ مغائرت اور نفرت کیوں؟

اُس نے پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب ہر دفعہ میرا اصرار بڑھتا ہی چلا گیا تو بعد از اصرار بسیار کہنے لگی

"وہ جواری ٹھیکہ دار جس کی آج کل میں داشتہ ہوں۔ تپِ دق کا مریض ہے۔ شدید قسم کے دق میں مبتلا ہے۔ میں اُس کے آتے ہی دو ایک پیگ وِسکی کے تو پی لیتی ہوں۔ تاکہ جراثیم اثر نہ کر سکیں لیکن مجھے شک ہے۔ دق کے جراثیم میری احتیاط پر بھی قابو پا رہے ہیں"۔

لہٰذا —— گو مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں انتقاماً تمہاری زندگی میں بھی یہ زہر سمو دوں اور تمہاری ہستی کے تار و پُود بکھیر کر رکھ دوں۔ لیکن تمہارے بعد میرے پاس کیا رہ جائے گا حیدر! میں کسی کے ساتھ ساتھ ایک عورت بھی تو ہوں اور عورت اپنے محبوب سے کبھی انتقام نہیں لیا کرتی۔

شہانہ کا کہنا سچ تھا۔ ہماری ملاقات کے چھ ماہ بعد خبر آئی کہ اُسے منصوری پہنچا دیا گیا ہے۔ اور پھر وہ مجسّمۂ وفا وہاں چار ماہ کا قلیل عرصہ

رہنے کے بعد داعئ اجل کو لبیک کہہ کر چلتی بنی . . . . !

لیکن حیدر ! یعنی اُن شاہ صاحب کو اس بازاری وفا کا کچھ ایسا چسکا لگا ہے کہ اب وہ میری دہلیز سے آ چپکے ہیں - بھولے کہیں کے ! ——
اُنہیں کیا معلوم کہ جس طرح

"ہر چیز چمکنے والی سونا نہیں ہوتی ؛

اسی طرح شاید ہر کوٹھے پر بیٹھنے والی کسبی شہانہ نہیں ہوتی -"

لیکن یہاں میں اُن مفتیانِ شرعِ دینِ متین سے ایک سوال ضرور کرونگی کہ اے زنڈی کے ادعائے وفا پر ہنسنے والو —— اگر شہانہ ہی کی طرح —— اِس بازار کی چلتی پھرتی عورت کو ایسا حادثہ پیش آجاتا - یا اگر اس دَور کی کسی وکٹری گرل کو (آہا کتنا پیارا اور فاتح لفظ ہے) اپنے کسی سابقہ چاہنے والے سے انتقام لینے کا ایسا نادر موقع میسّر آجاتا - تو کیا وہ اس سے درگزر کرتی ؟ کیا وہ بھی شہانہ ایسی عالمگیر قربانی ہی سے کام لیتی ؟

—— فیصلہ آپ پر رہا !! ——

مجھے افسوس ہے کہ یہ جملہ معترضہ کی بحث طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی - حالانکہ جب لکھنے بیٹھی تھی - تو آپ سے پوچھنے کے لئے میرے

پاس سب سے پہلا سوال یہ تھا۔

—— ان دونوں بازاروں میں جو عورت بکتی ہے کیا اُس کی فروخت میں صرف اُس کی ذاتی لذات اور اُمنگوں ہی کو دخل ہے یا پیچھے سے تار ہلانے والا پردۂ زنگاری میں معشوق کوئی اور ہے؟

- جس کے اشاروں پر وہ ناچتی ہے ؟
- جس کے پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے وہ یہ سارے عذاب جھیلتی ہے۔
- جس کے ذہن و جسم کے چٹخاروں کی تسکین کے لئے وہ بھرے بازاروں میں سوئیٹروں مفلروں اور جرابوں کی طرح فروخت ہوتی ہے —— اور ہاں!

کیا —— یہ فروخت دورِ حاضر کی ایجاد ہے؟

کیا —— اقتصادی پستی اور معاشی ابتری کا علاج سوائے عصمت فروشی کے اور کچھ نہیں؟

کیا —— عورت کو اس قدر ارزاں کر دینے میں صرف امراء و رؤساء کی بوالہوسیوں ہی کو دخل ہے یا علماء و فقہاء کے جعلی فتووں اور

"ناولوں کا بھی کچھ حصّہ ہے؟

یہ ــــ اور اس قسم کے بیسیوں سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے کوشش کروں گی کہ قارئینِ "لاہور" سے تبادلۂ خیالات کر کے ان کے متعلق کسی فیصلہ پر پہنچ سکوں ــــ آج صرف اسی قسم کے ایک اعتراض کا جواب دے کر ہی اپنی موشگافیوں کے سلسلہ کو بند کر دوں گی۔ جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ اب ضرور بارِ خاطر ہو گئی ہوں گی۔

وہ اعتراض ہے۔ پشاور سے ایک بی اے کے طالب علم کا لکھتے ہیں:

"آخر اب آپ کو اپنی اس زندگی کو ترک کر دینے میں کونسی روک ہے اور آپ کے پاس اب اس کسب کو جاری رکھنے کا جواز کیا ہے"

میرے پاس اس سوال کے کئی جواب ہیں لیکن میری طبیعت کو اُلجھاؤ سے لگاؤ ہے۔ لہٰذا آج صرف ایک شق ہی کا جواب دوں گی تاکہ وہ خود بھی غور کرنے کی کوشش کریں۔

میاں صاحبزادے! ــــ وجہِ جواز اس دنیا میں کس جُرم کس فعل

اور کس حرکت کے لئے موجود نہیں —— خدا دم سلامت رکھے ہمارے علمائے کرام اور شیوخِ اسلام کا۔ ہمارے اس کاروبار کے جواز کے دلائل سے تو کتابیں بھری پڑی ہیں۔ سنئے:

ہم دراصل یہ سارا کاروبار عقدِ اجارہ کے تحت کرتی ہیں جس ہیں علماء و فقہا کے نزدیک اگر

"ایک عورت سے زنا کے لئے اُجرت ٹھہرالی جائے۔ اور اس کے بعد عورت وہ اُجرت لے لے تو اُس کے لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔"

نہیں سمجھے۔ مثال کے طور پہ

"کسی شخص نے گھر کا کام کاج کرنے کے لئے یا کھانا پکانے کے لئے یا اور کسی فعل مباح کے لئے ایک عورت سے عقدِ اجارہ کیا کہ اتنی مزدوری پہ میرا کام کر دینا اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرا لی کہ تجھ سے زنا بھی کروں گا۔ تو گو یہ اجارہ فاسد ہوا لیکن اجرت حلال ہے۔"

یا بہ الفاظِ دیگر یوں سمجھنے کی کوشش فرمائیے۔

"اگر کسی دانائے حیل نے ذرا چشم و ابرو دیکھ کر کسی اچھی سی ماما کو کام کاج کے لئے مزدوری پر رکھ لیا۔ اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ٹھہرالی کہ گاہ بہ گاہ کچھ اور مشغلہ بھی جاری رہے گا، تو ایسی اُجرت اُس ماما کے لئے جائز، حلال اور طیّب ہے۔"

اب آپ میرے ان حوالوں اور اس استدلال پر لاکھ سر پٹیں۔ اور اسے لاکھ شریعت کی تباہی اور انسانیت کی ہلاکت قرار دیں۔ لیکن میں یہی عرض کروں گی کہ

یہ سب سچ ہے

کیونکہ یہ اُن علماء و فقہاء اور شیوخ اسلام کے ارشاداتِ عالیہ ہیں ——

"جن کی انگلیوں کے اشاروں پر حکومتیں ناچا کیں۔ جن کی نگاہ کی ایک ایک جنبش پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں سروں کے صدقے اُتارے جاتے رہے ——"

اور اُن کے سچا ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ آج بھی——

آپ میرے مُنہ پر تھپڑ مارنے کی جرأت تو کرتے ہیں لیکن ان اقوال و ارشادات قبیحہ کو کتب سے چھیل دینے کی جرأت نہیں کر پاتے۔ ان مکر و فریب اور ظلم و غضب کے مجسموں کے گریبان گیر ہونے کی ہمت آپ کو نہیں پڑتی۔

(ز۔ ج۔ گ)

لیکن اِن سے مرعوب ہونے کی ضرورت
نہیں۔ ان کے شانوں۔ بازوؤں اور پنجوں
کا کس بل مفلوج ہو چکا ہے۔ اِن کا کیا
ہے۔ اِنہیں اٹھنی یا چونی کی دُور ہی سے
چمک دکھا کر خواہ ملک کی عصمت کے
سودے کی بات کہہ لیجئے۔ انکی آنکھوں
میں چمک بے حیائی کی ہے۔ ان کے
ہاتھوں پر دمک بے غیرتی کی ہے۔ ان
کے بالوں میں الجھاؤ بدطینتی کے ہیں۔
یہ ہمارے مدقوق معاشرے کے
وہ گندے کیڑے ہیں جن کو کچل دینا
ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ سب
سے بڑا ثواب!

تیسرا خط

یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ مدیرِ محترم! کہ اب میں لکھوں اور مسلسل لکھوں آپ کے اغراض و مقاصد کے تابع ہو کر لکھوں۔ اپنے ماحول کی منجھی ہوئی بولی ٹھولی" کو بالائے طاق رکھ کر لکھوں ـــ وہ لکھوں جو آپ چاہتے ہیں۔ اور پھر اُسی ترتیب اور باقاعدگی کے ساتھ لکھوں جیسا کہ آپ کے قارئین کا تقاضا ہے ـــ نہ حضور نہ میں باز آئی اس جبری انشاپردازی سے!

میں بہت اچھا لکھتی ہوں! میرا طرزِ استدلال بہت مرغوب و پسندیدہ ہے! آپ کو میری زبان از حد پسند ہے! "شکریہ" اس حوصلہ افزائی کا! لیکن آئندہ زبان کی امان چاہتی ہوں ـــ میرے خیال میں تو ـــ آپ کو میری زبان تحریر۔ استدلال، کچھ بھی پسند نہیں۔ اگر کچھ لگاؤ ہے۔ کاروباری سا لگاؤ تو وہ بھی اُن واقعات سے۔ جن کے رُخ سے میں رفتہ رفتہ نقاب سرکا رہی ہوں۔ آپ کو دلچسپی ہے۔ تہذیب حاضر کے زخموں سے رستے ہوئے لہو سے جن کو میری نگاہیں متعاقباً ذرا قریب سے دیکھ رہی ہیں اور میرا

قلم بے پروائی کے ساتھ کہہ بیدر رہا ہے ـــ لیکن اے شاعر شیریں بیاں یہ کیوں بھولتے ہو کہ یہ لاوا بھی ہر وقت نہیں اُبلا کرتا۔ اس آگ کے چل پڑنے۔ اس ٹیس کے اُبھرنے اور اس دھوئیں کے اُٹھنے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ اور جب تک وہ کیفیت طاری نہ ہو۔

"نہ میں لکھ سکتی ہوں اور نہ آپ کا ذہن اس سے ادیبانہ لذت ہی حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ بعض دفعہ تو یہی داغ میرے لئے چراغ بلکہ چاند اور تارے بن جاتے ہیں اور میں ان سے اپنی مغموم تنہائیوں میں اجالا کرتی ہوں"۔

تجسس تو آپ کی آنکھوں کا بھی کم نہیں۔ دیرینہ زخموں کے بخیئے تو آپ کا قلم بھی کوئی کم نہیں اُدھیڑتا۔ ایک شاعر، پھر صحافی، گویا کریلا اور نیم چڑھا اور مجھے یقین ہے، نہ آپ کے مشاہدات ہی میری نسبت کم ہوں گے۔ لیکن آپ کے لئے ایک مجبوری ہے یہ کہ آپ کے قلم اور زبان پر تادیب و تعزیر کے پہرے مسلط ہیں اور میں جواز و عدم جواز کی حدوں کو پھلانگ کر کنارے پہ آ بیٹھی ہوں ـــ لہٰذا جو مُنہ میں آتا ہے وا ہی تباہی اگل ٹُٹ ہانک دیتی ہوں۔ اور نہ اس سے آپ کے جلے ہوئے دل کے کسی کونے

میں دبی ہوئی چنگاری پر تسکین کا ایک ہلکا سا چھینٹا پڑ جاتا ہے۔ کیوں ہے نہ یہ بات ٹھیک؟ کہ آپ بھی در اصل میری ہی طرح معاشرے کے ڈسے ہوئے ہیں اور اب حیلوں بہانوں سے بس گھول رہے ہیں؟ تو پھر یوں کیوں نہیں فرماتے کہ میرا اور آپ کا مضمون واحد ہے۔

آپ کے صحافیانہ تقاضے تو خیر پھر بھی کسی قدر در خور اعتنا ہیں لیکن اس بھڑوں کے چھتّے سے نجات کی کیا صورت ہوگی، جسے پچھلے مکتوب میں نادانستگی سے چھیڑ بیٹھی ہوں۔ ان کے فتووں ۔ تبرّوں اور لعنتوں کا مقابلہ کون کرے گا۔ وہ ساعت بھی کس قدر منحوس تھی۔ جب مجھے بزعم خویش، اصلاح احوال کے باؤلے کتّے نے کاٹا اور میں آئینہ لے کر سماج کے سامنے آڈٹی۔ پھر میری بے پناہ مصروفیتیں، جن کے دفتر میں فرصت کی گنجائشوں کا کوئی خانہ ہے ہی نہیں۔ یہ مفتیانِ دینِ متین کیا جانیں کہ میں یہ جو کچھ لکھتی ہوں تو اپنا کتنا کاروبار پلٹ کر کے لکھتی ہوں۔ اور میرا لمحہ کس کس طرح بک ہوتا ہے۔ اُف توبہ!

- جاگنا اور مسلسل جاگنا۔ گھنٹوں ۔ پہروں بلکہ راتوں جاگنا
- ہنسنا کھنکتی ہوئی ہنسی ہنسنا۔ خواہ مخواہ ہنسنا۔ ہر بات پر۔ بلکہ ہر غیر معقول

بات پر معقولیت کی ہنسی ہنسنا اوپری اور ڈالڈا قسم کی ہنسی۔

- غلط فہمیاں دلانا۔ محبت کا فریب دے کر کبھی محبّت کا فریب کھاکر اور کبھی یونہی۔
- اپنے آپ کو سنوارنا۔ اور سنوارتے چلے جانا۔ اپنی متعفن اور زخم خوردہ رُوح کو بانات کے بھاہوں سے ڈھانپنے کے لئے تاکہ میرے ملنے والے اُن سے بہتی ہوئی پیپ نہ دیکھ پائیں۔
- جسم، روح اور آنکھوں کے حلقوں اور داغوں کو چھپانے کے لئے پوڈر کریمیں اور غازے کھپانا؛

اور ان سب کے بعد جب کبھی فرصت میسّر ہو تو تنہائی میں اپنے افعال و کردار کا محاسبہ کرنے کے بعد اپنے محبوبِ حقیقی سے اپنے گناہوں۔ عشووں اور اپنی خبیث کرتوتوں کی معافی مانگنا، میری معروف ساعتوں کا پروگرام ہے بیکار۔ لوگ کیا سمجھیں۔ ع

دیکھتے ہیں جو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر

"اور میں ——— میں طوفان پیدا کرتی ہوں۔ طوفانوں سے کھیلتی ہوں اور بعض دفعہ تو خود ایک چلتا پھرتا طوفان ہی بن جاتی ہوں۔"

آپ اور آپ کے قارئین خصوصاً اس ہفتے کی ڈاک بھیجنے والے قارئین
میرے ـــــ "میں اور معبودِ حقیقی سے متعلق" ـــــ والے فقرے پر ہنس
دیے ہونگے لیکن یہ بات ہے سچی۔ میں بھی کبھی کبھی فی الواقعہ اس آستانے پر
جھکتی ہوں، سچے دل سے اُس کے آستانے پر جو اس سارے جگ کا پالنہار
ہے۔ اور جو کسی نہ کسی ذریعے سے ہر ایک کو پیٹ بھرنے کے لئے دیتا ہے
اور دیتا رہے گا۔ بلکہ بعض دفعہ تو میں اپنے ماحول کا گہرا تجزیہ کرنے کے بعد
یوں محسوس کرتی ہوں جیسے کوئی شے اپنی ذات میں نہ بری ہے نہ اچھی، اور
بدی ـــــ بدی تو دراصل ایک بھٹکی ہوئی نیکی ہے۔ بس ایک احساس ہو
اور بس احساس کا پرتو ہے جو جگہ جگہ مختلف ہیئتوں میں کار فرما ہے۔ رزق
عطا کرنا اس رزاق کا وعدہ ہے اور وہ کسی نہ کسی دریچے سے ہر بھکاری کی جھولی
میں یہ مَنّ و سلویٰ ڈالتا ہی رہتا ہے۔

اب کے شیخوپورہ سے ایک مولانا نے تو مجھ پر یہ پابندی بھی لگائی ہے کہ میں
بار بار اپنی پلید زبان سے خدا کا نام نہ لوں ـــــ گویا خدا بھی اُن کے محدود عقائد
اور بصیرت کی طرح کوئی ایسی چیز ہے جس کی حیا میرے بار بار نام لینے سے ماند
پڑ جائے گی۔ اس کی وقعت کم ہو جائے گی ـــــ کاش اُن پر بھی حقیقی انفعال

کی کیفیت طاری ہو سکتی ہے اور وہ اس قربِ ایزدی کی لذت کو محسوس کر سکتے۔ جو میں نے یہ اس آلائش دامن بارہا محسوس کی ہے، اور ۔۔۔ اے کاش! عصمت باختہ اپنا دل چیر کر انہیں اس میں اُس کا ظہور دکھا سکتی۔

مولانا! خدا ہر جگہ موجود ہے آپ کے تقوےٰ و طہارت سے بھرے ہوئے دل میں بھی اور مجھ گنہ گار کی شہ رگ سے قریب بھی۔ کوئی اس کے جلوے کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھٹکتا ہے۔ لیکن کوئی بھیڑوں کی جو ئیں نکالتے نکالتے ہی اُس کے دیدار سے فیضیاب ہو جاتا ہے۔ ابھی کوئی عشرہ گزرا ہے، میرے کوٹھے سے بیس قدم کے فاصلے پر دودھ دہی کی دکان سے متصل ۔ میں نے چھپا کے چبوترے پر اپنی سمجھ کے مطابق یہی نظارہ دیکھا۔ چھپا تقسیم کے بعد سے یہیں رہے ہے، ۱۹۴۸ء کے شروع تک جب تک لوٹ کے مال کی ریل پیل رہی چھپا خوب بکی، خوب ہی بکی۔ لیکن "اس بازار میں" بھاؤ کی تیزی تا کے، جوں جوں وہ دونوں ہاتھوں سے لٹتی گئی، دوسری طرف چھترے دکھا دکھا کر اینٹھا ہوا مال ختم ہوتا گیا، مندا پڑتا گیا (اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک رنڈی کے پاس جمع تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے تو وہ مستقل اور باقاعدہ تماش بینوں یا شریفوں کی متلاشی رہتی ہے) بس ایک ہی جھونکا ایسا آیا کہ خیمہ اُلٹ گیا اور

سارے کا سارا بزنس چوپٹ ہوگیا۔ اس پہ کراچی کے چھلکوں کی بندش کے بعد امپورٹ نے بدیشی خام مال کی کھپت اور بھی کم کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی سالوں میں اس سترہ سالہ بوڑھی چمپا کا بیوپار سوسو کے نوٹوں سے چند اٹھنیوں چونیوں پہ آگیا اور وہ حیدرآباد چھوڑنے پہ آمادہ ہوگئی ——— میں جو اُس کے تھڑے کے پاس سے گزر رہی تو ایک عجیب مغموم نظارہ دیکھا۔ چمپا اپنا سامان باندھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور اس کی پڑوسن ملکہ اسے روزگار کے نشیب و فراز کا فلسفہ بہ این الفاظ سمجھا رہی تھی۔

"چمپی! ——— نگوڑی نہ جا سکھر۔ کیا وہاں کوئی اور خدا ہے جو یہاں نہیں ہے۔ اگر اُس نے دینا ہے تو ہر حال میں یہاں بھی دے گا۔ منڈی کے بھاؤ کا کیا ہے۔ آج مندا ہے تو کل تیز بھی ہو جائے گا۔ پھر یہاں تو کچھ لوگ اب تیرا نام بھی لیتے ہیں۔ وہاں کس کے آسرے پہ پڑی رہا کرے گی میری ماں ——— اور صدق و یقین کے ساتھ یہیں بیٹھی رہ وہ پالن ہار ضرور دے گا آخر تو اس اندھی ماں کو کہاں کہاں ساتھ لئے پھرے گی پگلی!"

اور ریس ابھی سینما کا موڑ مڑی بھی نہ تھی کہ ایک تیرہ چودہ گز کی شلوار والا سندھی چمپا کے تھڑے کی طرف بڑھا اور ریلکہ اپنی قبولیتِ دعا پر فخر کرتی اور اس معبودِ حقیقی کا شکر ادا کرتی ہوئی دکان والے کے بنچ پر جا بیٹھی ؛

کیا میں اُن مولانا سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ ——

چمپا اور ریلکہ کی گفتگو میں جس خدا کا بار بار ذکر آتا تھا۔ وہ ان شیخو پورہ والے مولانا کے خدا سے کتنے درجے کم ہے اور کتنے انچ چھوٹا یا بڑا ہے جس کی فرماں روائی ان کوٹھوں تک بھی ہے۔

اگر آپ بُرا نہ مان جانے کا وعدہ کریں تو عرض کرونگی کہ اس دفعہ آپ نے جو مراسلتیں بھجوائی ہیں ان میں دلچسپی کم اور یبوست زیادہ ہے لہذا میں کم از کم اس صحبت میں مندرج کج بحثیوں سے کنارہ کرنا چاہتی ہوں اور ویسے بھی —— الفرار خیر من الفراد —— ہمارے علمار کا موٹو اور لائق صد تقلید اصول ہے - لہذا اگلی صحبت پر —— اور اب رجوع کرتی ہوں اپنے اس مکتوب کی طرف جس کے کچھ نقوش ادھورے رہ گئے ہیں!

ہاں محترم! تو بحث ہو رہی تھی کہ ان دونوں میں نمایاں فرق کیا کیا ہیں۔

اور ان دونوں بازاروں میں —— مادی اور روحانی لحاظ سے ——

کتنا فاصلہ ہے؟

جہاں تک فاصلے کا سوال ہے وہ تو اب روز بروز کم ہو رہا ہے - اور اہلِ نظر کے نزدیک تو اب محض برائے نام ہی سا ہے — کیا آپ کو کبھی اس کوچہ تک جانے کا اتفاق ہوا ہے - اگر ہوا ہے تو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا ہمارے تھڑوں کے اِردگرد چند بابو قسم کے لوگوں کو چکّر کاٹتے اور شاید یہ ہماری مجلس اشاعت کے کارکن ہیں لیکن — نہیں، یہ دراصل ہمارے کاروباری دشمن ہوتے ہیں، بلکہ اس بازار کے جاسوس کہئے - انہیں — جو کاروباری قواعد کو بھاڑ میں جھونک کر ہمارے روزگار پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے چلے آتے ہیں - آپ ذرا اِن کے قریب ہوتے اور انہوں نے بڑی سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا:

"بابو جی پرائیویٹ!"

اگر آپ تماش بین ہوئے تو بات وہیں سے شروع - ورنہ وہ کسی اور کے گرد ہو جائیں گے - اور آپ یہ سوچتے ہوئے آگے نکل جائیں گے کہ شاید اُس شخص نے محض — آپ جیسے پرائیویٹ آدمی کو ایک شارع عام پر چلتے دیکھ کر اظہارِ استعجاب کیا ہے۔

اب اس لفظ "پرائیویٹ" کا عدہ وار لجہ سنئیے - میرے نزدیک یہ اس بازار کا نرقی پسند گروپ ہے --- فارورڈ بلاک --- جس نے بڑھتے بڑھتے ہمارے عین پڑوس ہی میں خندقیں کھود لی ہیں - یہ یہ تیتی ہیں - اکثر ہمارے کوٹھوں اور ڈیرہ دل کے پچھواڑے والے مکانوں میں باقاعدہ مکان یا دُکانیں لگانے کی بجائے ہمارے عقب میں رہنے والے مکینوں ہی سے ٹھیکہ کر رکھا ہے - وہ ان سے مکانوں کا کرایہ بھی لیتے ہیں ان کی دلالی بھی کرتے ہیں گاہک بھی پھانس کر لاتے ہیں اور اس طرح روزکی آمد و رفت اور عملی درس و تدریس سے - اُن کی بچیاں بھی ساتھ کے ساتھ یہ کاروبار مفت میں سیکھ جاتی ہیں --- اُن کے لائے ہوئے گاہکوں پر واپسی کی ادائیگی فرض ہوتی ہے یعنی اگر دیکھنے کے بعد مال پسند نہ آئے تو بیعانہ ہضم یہ بیعانہ یعنی واپسی عموماً ایک روپیہ اور حد دو روپے ہوتی ہے جس میں سے دس آنے ایجنٹ کے اور چھ آنے اس "پرائیویٹ" کے ہوتے ہیں - اور اگر سودا پکا ہو جائے تو کرے سے کرائے کے علاوہ ایک چوتھائی ایجنٹ کا ---- لیکن اگر کوئی دانخص واپسیوں ہی پر گزر جائے تو رات گئے - حساب یوں ہوتا ہے -

"گل واپسی تین روپے۔ سگریٹ دس آنے۔ پان ۲ دو آنے، دودھ چار آنے۔ باقی دو روپے، سوا میرا باقی تو یہ بارہ آنے، خداحافظ!"

اور وہ پرائیویٹ بارہ آنے لے کر فجر کی اذان ہوتے ہی اپنے باغیرت میاں کے پہلو میں جا بیٹھتی رہی ہے۔ جسے اس پر فخر ہے کہ

"اُسے ایک ایسی سُگھڑ بیوی عطا ہوئی ہے جو اُس کے لئے دن رات کام کرتی ہے، جسم بیچتی ہے۔ رُوح بیچتی ہے۔ لیکن اُس کے چرٹ سُلفے میں رتی بھر فرق نہیں آنے دیتی!"

اب لگے ہاتھوں ان بابو لوگوں کا حُلیہ بھی سُن لیجئے شاید کہیں سابقہ پڑ ہی جائے آپ کو

"اُبھرے ہوئے شانے۔ شانوں میں کروٹیں لیتی ہوئی مچھلیاں۔ فولادی پنجے۔ گھنگریالے بال۔ شلواروں کے پائنچوں پہ پان کی پیک کے چھینٹے۔ پاؤں میں چودھپوری یا چاندنی جوتے۔ اور گردن میں سونے کا تعویذ۔ یہ شیو عموماً رات کے وقت بنواتے ہیں اور گولڈ فلیک کی ڈبیا اکثر ان کے سامنے کی جیب سے ان کے بُشرے کی طرف جھانکتی رہتی ہے۔

ان سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں - ان کے شانوں۔ بازوؤں
اور پنجوں کا کس بل مفلوج ہو چکا ہے - ان کا کیا ہے اُنہیں اٹھنی یا چونی کی
چمک دُور ہی سے دکھا کر خواہ ملک کی عصمت کے سودے کی بات کر لیجئے
ان کی آنکھوں میں چمک بے حیائی کی ہے - ان کے ماتھوں پر دمک بے غیرتی کی
ہے - ان کے بالوں میں اُلجھاؤ بد طینتی کے ہیں - یہ ہمارے مدقوق معاشرے
کے وہ گندے کیڑے ہیں - جن کو کچل دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے سب
سے بڑا ثواب ؟

پھر ان سے بھی بڑھیا ایک کلاس ہے - وہ پرائیویٹ کی بجائے ریڈی
مال کی امپورٹ کرتی ہے - اور اونچے تاجروں کی طرح بعض دفعہ "گڈ وِلڈ"
یعنی محض عنوانوں ہی میں سودا ہو جاتا ہے ان کے سٹاکس کے گودام ہیں
تو ہماری ہی طرح کے کوچوں میں لیکن عصرِ حاضر سے مرعوب ہو کر ان کوچوں
نے بھی انگریزی لبادے اوڑھ لئے ہیں - بس جیسے کوئی شاہی محلہ کا نام
رائل پارک رکھ لے -

ان صاحبوں کو پہچاننا ذرا فہم و فراست کا کام ہے - کیونکہ اُن کی رسائی
بڑے بڑے اونچے محلوں تک ہے - ٹیکسیوں میں سفر کرتے ہیں - وزراء

کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں ——
اور آخر شب والے ڈانس میں تو جب تک یہ نہ ہوں پیشہ ور ناچنے والیوں
اور ناچ دیکھنے والوں کو مزا ہی نہیں آتا۔ یہ خود بڑے بڑے اڈوں پر
رہتے ہیں لیکن ان کے سب ایجنٹس آپ کو ہر چوک میں —— ہر ہوٹل میں۔ اور
اکثر پشاوری تانگوں پر ملیں گے۔

یہ اکثر تازہ پریس شدہ پتلون پہنتے ہیں۔ گرمیوں میں بھی گرم —— فیشن
کے عین مطابق۔ کالج کے اپ ٹو ڈیٹ رواج پر ٹھیک قمیص کے اوپر
کے اوپر کے بٹن اکثر کھلے رکھتے ہیں۔ تاکہ جوانی سے بھرپور سینے کے
بال جھانک کر ان کی مردانگی کا پروپیگنڈا کرتے رہیں۔ سر پہ
اکثر بڑے بڑے بال پیچھے کی طرف اکٹھے کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض کے
گلے میں ایک آدھ ریشمی رومال یا مفلر بھی ہوتا ہے

ان کی مندرجہ ذیل شناختیں ہیں۔

یہ بات بات میں کسی بڑے وزیر۔ سفیر۔ ایم۔ ایل۔ اے یا بڑے
افسر کا خواہ مخواہ بھی ذکر کریں گے تاکہ ان کی بلند نشینی کا سکہ بیٹھ سکے
ان کی گلابی اردو میں جگہ جگہ غلط انگریزی الفاظ آتے ہیں۔ ان سے

چھیڑنے کے لئے سب سے بہتر ذکر فلموں کا ہے اُس سے ہٹ کر سینما کے مالکوں کا۔
اور اُس سے گِر کر پاکستانی ایکٹرسوں اور ایکسٹرا گرلز کا۔"

ان کے دانت پان خوری کی کثرت اور زردہ خوری کے باعث اکثر غلیظ ہوتے ہیں۔ ان کے منہ کے قریب ہو کر بات کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ نہ جانے کب تعفن کا کوئی بھبکا آپ کے دانتوں کو پائیوریا کے جراثیم سے نواز دے۔

اُن کی سب سے کامیاب پہچان ---- ان کا ہر راہ چلتی عورت کو مخصوص انداز سے تاڑنا ہوتا ہے۔ عورت پر ان کی نظر ساری دنیا سے ہٹ کر بھی پڑے گی۔ خواہ وہ سو گز پرے کہیں گزر رہی ہو۔

"اور یہ اس کی ایڑیوں کو دیکھ کر ہی اُس کی فرصتِ آرائش کے جانچنے اور نفسیاتی اندازے میں محو ہو جائیں گے۔"

عصمتوں کے بیوپاری ایجنٹ اکثر گاہکوں کو بڑے سلیقے سے ملتے ہیں۔ بس آپ کا پیغام پہنچا۔ انہوں نے فقرہ کی بجائے بھاؤ کا آخری ہندسہ بتایا۔ صبح آنے کا ٹائم دیا اور بس! باقی آپ جانیں یا ہوٹل والا۔

"اور اب تو اکثر ہوٹل والوں نے بالواسطہ کمیشن کی طرح اُٹھا کر خود ہی براہِ راست کاروبار شروع کر دیا ہے۔ مسافر نے جس درجہ کا کمرہ مانگا

اشارہ پاکر اُسی درجہ کا مال حاضر کیا اور صبح کرائے کے ساتھ ہی دکھشنا
بھی وصول کر لی۔ اور یہ کون نہیں جانتا۔ کہ آج کل ہوٹلوں میں کمائی ہی
صرف اسی ایک کام کی ہے۔ کھانے پلانے میں کیا خاک دھرا ہے!
یہ رہا فاصلہ، اب لگے ہاتھوں گزشتہ سے پیوستہ ایک اور فرق بھی
سنتے جائیے۔ دونوں بازاروں کے امتیاز کی ایک نمایاں خلیج جو اب روزبروز
وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میرے بازار کا پردہ داری کی طرف
——— اور اس بازار کا نمائش۔ آرائش۔ عریانی اور کھُل کھیلنے کی طرف
رجحان ہے۔
میرے اس قول کی تصدیق آپ اونچی سوسائٹی کی استقبالی دعوتوں
میں بآسانی کر سکیں گے۔ جہاں تہذیب فیشن اور معاشرت اپنی پوری
رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور جہاں اکثر لوگ میرے بازار کی
کسبیوں کو بھی بعض دفعہ "مسنز" بنا کر لے جاتے ہیں!
جو عورت زیادہ سگھڑ نے، سر پہ دوپٹہ۔ اوڑھے رکھنے پہ بضد ہو
جس کی قمیص پورے گلے کی ہو۔ اور آستینیں پورے بازوؤں کی جس کے
چہرے پر غازے اور پوڈر کی سازشیں کم ہوں اور ہونٹوں پہ مقابلتہً سرخی کم

رلپی ہوئی ہو بس جان لیجئے۔کہ — ۔ وہ میرے بازار کا مال ہے ۔ وہ ہر آن۔
ہر لمحہ آپ کو اسی کوشش میں مصروف نظر آئے گی کہ کہیں میری کسی حرکت سے
بازاری پن آشکار نہ ہو جائے۔لیکن وہ جو بغداد کے چور جیسی فلم میں کام کرنے
والی ایکٹرسوں کا سا میک اپ کئے ہوئے ہوں جن کی ہر بات میں تصنّع ہو اور
جن کی نگاہ اپنے خاوند کے چہرے پر اس طرح پڑے جیسے ساڑھی کے بعد
پھسل کر بوٹ کی ٹو پر آ رکتی ہے جن کے جسم کا انگ انگ تیکھا نوکدار۔
ناقابلِ برداشت اور دانستہ نمایاں کیا ہوا ہو۔اور جن کا لباس گردن سے
½ افٹ نیچے سے شروع ہو کر گھٹنوں سے آدھ فٹ اوپر ہی ختم ہو جاتا
ہو۔وہ مال اس بازار کا ہوتا ہے اس آپ کے مہذب بازار کا،،
وہ بڑی بے ساختگی سے آپ سے ہاتھ ملائیں گی ۔ وہ بڑی بے دردی
کے ساتھ آپ کے ہاتھ ہاتھ میں لیکر مسلیں گی۔آپ کار میں لفٹ دیں گے
تو بڑے ٹھسے سے آپ کے جسم سے اپنا پہلو چپکا کر بیٹھیں گی۔
تاکہ آپ کی دست درازیوں کو حجاب نہ آجائے"۔
گویا جو مشرقیت کے عرق میں ڈوبی ڈوبی جائیں اور سمٹ سمٹا کر کونوں
کھدروں میں جائے پناہ ڈھونڈیں ۔ وہ حوّا کی بیٹیاں میرے ماحول کی اور

جو تمام بند ھنیں توڑ تاڑ کر شو کیس ہیں آ بیٹھنے کے لئے بے تاب ہوں۔ وہ تیتریاں اِس بازار کی —— اِس آپ کے بازار کی —— کاش! وہ اپنے متوالوں حُسن کی محفلوں کے ان بھونروں کو سمجھ سکیں۔ سرِ راہ مل کر کسی بدلیشی زبان ہیں عمر بھر کے وعدہ ہائے وفا کر جانے والوں کی میعادِ وفا کا اندازہ کر سکیں کہ ان کے گندے پانی کی طرح تیز بہتے ہوئے ایفائے عہد کی جلا عارضی ہے۔ فانی ہے۔ ایک دھوکا ہے۔ ایک خواب ہے۔ ایک ڈراونا اور عبرت آموز خواب!

(ز۔ ج۔ گ)

ملعون چھوکری! ڈر اُس وقت سے
جو ہر بے باک۔ بدگفتار اور بدکردار کے
سر پر منڈلا رہا ہے وہ دن —— وہ نہ
ٹلنے والی ساعت جب تمہارے اس
متعفن اور بڑبولے مُنہ میں انگارے
ٹھونس دیئے جائینگے۔ اور دہکتی ہوئی
آگ کی مانند سُرخ آہنیں کانٹے سے
تمہاری لچر زبان کھینچ کر باہر نکال دی جائیگی۔
آپ صاف صاف یہ تسلیم کیوں نہیں
کر لیتے کہ ان شیوخِ اسلام نے اپنے
رب سے غداری کی انہوں نے چند ٹکوں کے عوض احکام
خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیا اور اسکی مخلوق پر
گمراہی کے دروازے کھول دیئے وہ ذمہ دار ہیں ہماری
ان تمام بدعنوانیوں کے اور ان کی سزا و جزا کا معاملہ
سلجھنے میں ہم سے بھی کچھ زیادہ وقت لگے گا

چوتھا خط

بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہ میرے سامنے ایک
کف در دہاں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے جس سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں ہمت
نہ جرأت ۔ خدا جانے وہ کون مردانِ دلیر تھے جو ان طوفانوں سے ٹکرا کر بھی کامران
پار اُتر گئے اور غیظ و غضب کے تُند تھپیڑے ان کی جرأتوں کے مُنہ آنے کی
توفیق نہ پا سکے ۔ آج اس راہ پہ قدم زن ہونے لگی ہوں جو ڈراونا بھی ہے ۔
پُر خطر بھی اور میرے لئے اجنبی اور غیر مانوس بھی اور جس کی مسافت کی دشوار یوں
کے متعلق میری معلومات پہ برائے نام کا لیبل بھی چسپاں نہیں کیا جا سکتا ۔ گویا مرحلہ
درپیش ہے علماء کرام اور شیوخِ اسلام کے خطوط کی ورق گردانی اور
جواب دہی کا ۔ یا اللہ رحم !

اس خریطہ عالیہ میں اس وقت تک جو کل ستائیس گرامی نامے پہ دئے ہوئے
تھے میں نے ان کو تین علیحدہ علیحدہ فائلوں میں منسلک کر لیا ہے ۔

اوّل :۔ وہ تیرہ خطوط جن کا مضمون واحد ہے ۔

دوم :- وہ نُو خطوط جن کا استدلال بحیثیت مجموعی ایک سا ہے۔

سوم :- وہ پانچ خطوط جن کی دھمکیاں ایک ہی سانچے کی ڈھلی ہوئی ہیں۔

چنانچہ مشتے از خروارے۔ اب میں ان تینوں فہرستوں میں سے ایک ایک سر فہرست نامے کو لئے لیتی ہوں تاکہ میں اور میرے قارئین دونوں زحمتِ طوالت اور کج بحثی کی "بوریت" سے محفوظ رہ سکیں۔

پاکستان کے وفاقی دارالحکومت کے ایک مولانا درم جامعی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"... ملعون چھوکری! ڈر اس وقت سے جو ہر بے باک، بدگفتار اور بدکردار کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ وہ دن۔ وہ نہ ٹلنے والی ساعت جب تمہارے اس متعفن بڑبولے مُنہ میں انگارے ٹھونس دیئے جائیں گے۔ اور دہکتی ہوئی آگ کی مانند سُرخ آتشیں کانٹے سے تمہاری لچر زبان کھینچ کر باہر نکال دی جائے گی۔ تو نے وارثانِ انبیاء کے خلاف گستاخی کی ہے یاد رکھ تیری عاقبت کو ایک سیال آگ میں غوطے دیئے جائیں گے"...

میرا خدا ـــ مجھے اور مولانا دونوں کو اس گھناؤنے عذاب سے محفوظ رکھے آمین!

دوسرے ایک شیرازی گُنیّت کے عالمِ دینِ متین کوئٹہ سے تحریر فرماتے ہیں :۔

"۔۔۔۔ وہ لوگ جنہوں نے عقدِ اجارہ کی اجازت دی۔ اُن کی نیتوں میں فستور تھا۔ وہ اس وقت کے اربابِ اقتدار کی بوالہوسیوں کے آگے عاجز اور سر بہ خم ہو گئے ورنہ ایک صحیح الدماغ اور شریف فطرت عالم تو کبھی بدکرداری کی تائید نہیں کر سکتا خواہ وہ کسی رنگ ہی میں کیوں نہ ہو اور وہ خواہ علمِ تاویل سے کتنا ہی واقف کیوں نہ ہو"

اور میرے خیال میں تو یہ بھی کوئی عجب نہیں کہ آپ جیسی کسی چرب زبان ہی کا اُس عالمِ وقت کے دماغ پر ایسا جادو چل گیا ہو کہ وہ نشے اور سُکر کے عالم ہی میں اس حرکت کے مرتکب ہوئے ہوں اور اُسی حرّافہ نے اُنہیں ورغلا پھسلا کر اُن سے مکر و حیل کی ایسی ایسی راہیں پیدا کرائی ہوں ۔۔۔۔!"

اور تیسرے ایک ترقی پسند مولٰنا ابوالجمیل صاحب عمرانی یا عبرانی۔ (بدقسمتی سے وہ میرے ہی جیسے بدخط واقع ہوئے ہیں) آپ کے مشہور شہر لاہور ہی کے رقمطراز ہیں ان کا استدلال بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

"اُس ہنگامی اجازت کا وقت گزر چکا وہ خاص حالات تھے۔ جن کے تحت ایسی کشائشیں پیدا ہوئیں، جنگوں کا غیر معمولی دور اور مسافرت و غربت کے غیر معمولی حالات لیکن اس وقت کے ہنگامی حالات کی آڑ لے کو ہمیشہ کے لئے معاشرہ میں بدکرداریوں کے جراثیم پھیلاتے رہنے کی گنجائش کہیں نظر نہیں آتی نہ آپ کی کسی اور دوسری ہم جنس کے لئے۔ نہ اس بازار میں نہ اُس بازار میں۔"

علماء کا انداز تخاطب خصوصاً جب مخاطب کوئی مجھ ایسی بے علم مخلوق ہو عموماً تلخ، سخت اور زجر و توبیخ سے معمور ہوتا ہے۔ اسی قسم کی کڑک سے یہ تمام نامے بھرے ہوئے تھے۔ آپ یقین مانئے میں نے ان بزرگوں کا احترام کرتے ہوئے ان نوازشناموں کے وہ ٹکڑے پیش کئے ہیں جن کی عبادت لطیف۔ انداز نسبتہً شریفانہ اور قابلِ فہم تھا تاکہ نہ آپ کی سماعت کا دل دہلے نہ مجھ پر ہی ان کے اقتباسات پیش کرتے وقت از سرِ نو کپکپی طاری ہو — ورنہ خیر سے ان ہی ستائیس تادیب و تعزیر کے مرقعوں میں وہ وہ فصیح و بلیغ مغلظات سموئی ہوئی ہیں کہ دشنام طرازی کی لغت میں بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن نہ۔

"چونکہ چشم پوشی اور اغماض بھی کوئی چیز ہے میں انہیں نظر انداز کرتی ہوں۔ تاکہ مجھ میں اور ان علمائے کرام میں بہرحال کوئی نہ کوئی اخلاقی حدِ فاصل ضرور قائم رہے۔

اور اب بالترتیب ان تینوں بزرگوں سے التجا پرداز ہوتی ہوں:۔

جامعی صاحب! آپ کا مکتوبِ گرامی جس دردناک عذاب کی خبر دے رہا ہے اُس سے کون مُنکر ہے۔ پھر ایک مسلمان جس کے ایمان کی ایک بنا ہی سزا و جزا پر یقین واثق رکھتا ہے۔ لیکن خدا آپ کی فراستوں کو علمی مطالعہ کی آنچ سے رُوشناس کرائے کوئی دلیل بھی تو دی ہوتی! اس بات کی کہ یہ عذاب صرف اور صرف میرے" لئے وقف ہے اور آپ ایسا بے دلیل مناظر اس میں بھی ہرگز کوئی ہاتھ نہیں بٹائے گا میرا۔ محترم سوال یہ ہے کہ "اُن بزرگوں نے۔ آپ کے پیشروؤں نے۔ ہمارے جعلی ہادیوں نے۔ ایسا کیوں کیا خدائی تعلیم میں اپنی حرص اور آلائشوں کے پیوند کیوں لگائے؟ اور آپ مجھے ڈرا دھمکا رہے ہیں —— ! اور اب اگر میں آپ کی علمیت کے اس بھرم کے آشکار ہو جانے پر الزامی طور پر یہ کہنے کی گستاخی کر بیٹھوں کہ "اے بات کو سمجھنے اور سوچ کر جواب نہ دینے اور غلط بحث پیدا

کرنے اور اُسے اپنے علم کی کم مائگی کو عذاب و ثواب کے بھاری بھر کم الفاظ کا نقلی لبادہ اوڑھا کر پیش کرنے والے عالم بے عمل!

ڈر اس وقت سے جو ہر بے باک۔ بدگفتار اور بدکردار پر اک نہ اک دن آنے والا ہے وہ دن۔ وہ نہ ٹلنے والی ساعت جب تمہارے اس لفاظ مُنہ میں رمجھے بھلا متعفن کہنے کی جراُت کہاں) جہنم کے انگارے ٹھونس دئیے جائیں گے اور دہکتی ہوئی آگ کی طرح سُرخ آتشیں کانٹے سے تمہاری زبان کھینچ کر باہر نکال دی جائے گی۔

تو مجھ میں اور آپ میں تمیز! اور پسِ پردہ سننے اور پڑھنے والے قاری یا سامع پر اثر!! للّٰہ اپنی متشرع وضع قطع کی آڑ نہ لیجئے۔ ضروری نہیں کہ آپ فہم و فراست کی باتوں میں بھی دخیل ہوں۔ اگر یہ آپ کے بس کا روگ نہیں تو اسے اپنے سے زیادہ عقلمندوں اور معاملہ فہموں پہ چھوڑ دیجئے ـــــ میرے نزدیک تو قصور ثابت کئے بغیر محض لغت اور حجازی تلفظ کے بل ہی پر کسی کو سزا وار تعزیر ٹھہرا دینا حق و انصاف کی تضحیک اور خالص ملّائیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

باقی رہے شیرازی صاحب تو ان کی تحریر اس لئے درخور اعتنا نہیں کہ

در پردہ انہوں نے خود ہی تسلیم فرما لیا ہے کہ گویا

- علماء ارباب اقتدار کے ہاتھوں بکتے بھی رہے ہیں۔
- علماء کی نیتوں میں زر کی چکا چوند سے متاثر ہو کر فتور بھی آ جاتا رہا ہے۔
- وہ اللہ کے احکام کو اقتدار کے اشاروں پہ توڑ مروڑ کر بھی پیش کرتے رہے ہیں۔
- بلکہ ارباب اقتدار تو ایک طرف کسی نہ کسی عالم دین اور شیخ الاسلام کے حواسِ خمسہ پہ کبھی کوئی مجھ جیسی چرب زبان بھی مسلط رہی ہے۔

گویا بالفاظ دیگر ہمارے رہبرانِ ملّت کا اصل مذہب پیسہ ہی رہا ہے

تو محترم شیرازی صاحب

مجھ میں اور آپ ایسے علمائے کرام میں فرق! صرف یہ کہ!

- میں جسم بیچتی ہوں اور آپ ضمیر!
- میں عصمت کا بیوپار کرتی ہوں اور آپ ایمان کا!
- میں ایک کنبہ کی ناموس فروخت کرتی ہوں اور آپ قوم کی!
- میں صرف اپنے آپ کو فریب دیتی ہوں لیکن آپ اپنے علاوہ خدا کو بھی۔ اُس کے محبوب رسولؐ کو بھی اور اس کی اُمت کو بھی جُل دیتے ہیں۔

مگر گردن زدنی اس کے یا وجود — میں — اور صرف میں! مگر شیرازی محترم یاد رہے

- اس دور کا اقتدار نسبتًہ زیادہ جابر و مقتدر ہے۔
- اس دَور کے سیم و زر کی چکاچوند نسبتًہ زیادہ خیرہ کن ہے۔
- اس زمانے کے غزالوں اور عشوہ طرازوں میں نسبتًہ زیادہ جاذبیّت اور کشش ہے۔ ان کا نشہ زیادہ تُند۔ ان کا خمار دیرپا اور ان کا سحر زیادہ پائیدار ہے اگر آپ کے خمیر میں یہ کمزوری ہے اور ہے! تو پھر نہ آپ کی زندگی کی خیر ہے نہ عاقبت کی۔!

آپ اور آپ کی یہ زندہ جاگیریں آج بھی ڈوبیں اور کل بھی۔ خدارا بچ کر چلئے۔ یہاں قدم قدم پر کمین گاہیں ہیں۔ ایک ایک انچ پہ فریبِ حُسن و عشق کے دام بچھے ہوئے ہیں۔

البتہ عمرانی صاحب نے ذرا ان دونوں بزرگوں سے ہٹ کر ایک ڈگر اختیار کی ہے۔ اور وہ اس مادی دور سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ اسلام اور اس کی تعلیم تمام قوموں اور تمام جہانوں بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے ہے۔ لہذا وہ ایمان و ایقان کو مصلحتوں کے ترازو

میں تو لئے اور تقاضائے وقت کے مطابق توڑ مروڑ کر ڈھال لینے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک مسافرت اور غربت کے اس ہنگامی دَور میں جنگی مصلحتوں کے تحت عقد اجارہ ہی جائز تھا۔ سب سے نیک اور معقول تاویل یہی تھی محض اس لئے کہ اس اجارہ کے ساتھ ایک عربی لفظ "عقد" ٹنکا ہوا ہے۔

انہیں کیا خبر کہ ان کا سائل ایک ایسا کٹّر اور بے باک سائل ہے جس کے نزدیک خواہ اجارہ کے دونوں فریق "عربی الاصل ہوں"۔ یہ چیز کوئی وقعت ہی نہیں رکھتی اور یہ فعل خواہ مسافرت میں تھا خواہ میدانِ کارزار میں یا پائیں باغ میں نصب کسی خیمے میں — محض تعیش تھا۔ بدکرداری تھی۔ بلکہ زنا تھا۔ خالص اور ظاہر و باہر زنا۔

اور اگر میری عقل سے بالا کسی استدلال کی بنا پر جائز و مستحب اور عین احکام تھا تو میں ڈنکے کی چوٹ یہ کہنے کی جرأت کرونگی کہ ..... یہ دَور اُس کے جائز قرار دئیے جانے کا بہترین دَور ہے۔

- یہ لمبی لمبی مسافتوں اور غربتوں کا دَور
- یہ ایٹمی اور آتشیں جنگوں کا ناقابلِ برداشت عرصۂ محشر

- یہ اقتصادی اور معاشی ابتری و پستی کا زمانہ

کاش! عمرانی صاحب ملگے ہاتھوں اس شق پر بھی روشنی ڈال پاتے

کہ یہ

- مستحب فعل کب جائز قرار دیا گیا
- اس کی ترویج کا سہرا کس مردِ مجاہد کے سر ہے۔
- اور آج اگر ظاہری صورت میں پھر ویسے ہی حالات پیدا ہو جائیں تو کیا

عمرانی صاحب ویسا ہی فتوے صادر کرنے کی ضمانت دیتے ہیں۔

پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر نمایاں چوکھٹوں میں چھپی ہوئی تھی۔ کہ

"اس وقت امریکی جنگی سپاہیوں کے سات ہزار حرامی بچے برطانیہ

میں، ایک لاکھ جاپان میں اور پچاس ہزار جرمنی میں ہیں۔ اور امریکہ ان کی

تعلیم و تربیت کے انتظام پر غور کر رہا ہے"۔

اور روس نے تو اپنے سپاہیوں کے ایسے ہزاروں بچوں کا اہتمام کر بھی

لیا ہے۔

عمرانی صاحب کے نزدیک ان بچوں کو حرامی کہنا کہاں تک جائز ہے جبکہ

وہ اہلِ کتاب جنگی سپاہیوں کے کرشمے ہیں۔ ہنگامی عقد اجارہ کے نتائج۔

ان سپاہیوں کے جو ملک و قوم کے لئے سینہ سپر ہوئے اور جنہوں نے اس کی آبرو کو قائم رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

بلکہ بسا ممکن ہے ان سپاہیوں میں بیشتر امریکی اور روسی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہوں۔ اُن کے نقوشِ پائندہ کے متعلق عمرانی صاحب کی تازہ اسلامی ریسیرچ کیا کہتی ہے ؟

"کیا ہمارے معاشرے میں ان مقدس بچوں کا مقام بھی میرا اور عمرانی صاحب ایسا ہی ہوگا۔؟"

للہ اسلام پر رحم فرمائیے اور سوچئے ـــــ کہ محض میری بے باک گفتاری پرجز بز ہو کر ہی آپ کا خوشبو دار گلوری بھرا غنچہ سا دھن کیا کیا بے ہنگم باتیں اُگل رہا ہے۔

عمرانی صاحب غلطی بہر حال غلطی ہے خواہ آپ کی ہو میری ہو یا شیخ الاسلام عبد النبی کی آپ صاف صاف تسلیم کیوں نہیں کرتے کہ ان . . .

شیوخِ اسلام نے اپنے رب سے غداری کی وہ نفس کے بندے تھے لہذا انہوں نے چند ٹکوں کے عوض احکامِ خداوندی کو بسِ پشت ڈال دیا اور اُس کی مخلوق پر گمراہی کے دروازے کھول دیئے۔"

وہ ذمہ دار ہیں ہماری ان تمام بدعنوانیوں کے اور ان کی سزا و جزا کا معاملہ سلجھنے میں ہم سے بھی کچھ زیادہ وقت لے گا بلکہ کوئی عجب نہیں کہ ہمارے گناہوں کی پوچھ گچھ بھی ہماری بجائے انہی جبّوں۔ دستاروں اور عماموں ہی سے ہو

قارئینِ لاہور سے معذرت کہ یہ خشک بحث طول پکڑ گئی۔ یہ لکیر ہی کچھ ایسی ٹیڑھی تھی کہ اسے سر کرنے میں سلاست کا چوکڑی بھول جانا لازمی تھا درحقیقت ایک انسان۔ ایک ذلیل سے ذلیل انسان کے ساتھ بھی بشریت کے تمام تقاضے ہمیشہ چمٹے رہتے ہیں ان تقاضوں یا نقائص میں سب سے بڑی خامی خود فریبی اور خوش فہمی ہے۔ جس میں مبتلا ہو کر ہر انسان اک نہ اک موڑ پہ پہنچ کر اپنا اصل مقام بھول جاتا ہے۔

یہی حال اس بحث کی رَو میں بہہ کر میرا ہوا کہ ایک پرِ کاہ کو کلّہ کوہ کے مُنہ آنے کی جسارت مل گئی لیکن یہ سب عارضی تھا۔ ناپائدار تھا۔ جعلی تھا۔ مَیں اب پھر وہیں ہوں۔ جس قعرِ مذلّت کہ تھی اور وہ اِس ملّت کے ناخدایانِ باعمل پھر اسی بلند مسند پر ہیں جو ان کے لئے پیدائش کے وقت ہی سے مقدّر ہو چکا ہے۔ میری یہ جرأتِ رندانہ واقعی خود فریبی

کی ایک لغزش اور خود فہمی کی ایک بدترین حماقت تھی —— ورنہ میں اور اُمت کے نجات دہندوں کے مُنہ آتی اور اُن کی عظیم شان کے خلاف کوئی اُلٹا سیدھا حرف زبان پر لاتی۔ میری کیا مجال! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میرے مُنہ میں خاک!!

(ز۔ ج۔ گ)

ہوٹل کی اس مالکیت سے پہلے آپ
پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور ہندو طبلچی کی روایت
کے مطابق نوکری کے زمانے میں بھی بڑے نیک۔
پارسا اور نمازی تھے۔ گو سماعت کا چسکا اور
کوٹھوں پر جانے کا چسکا حوالداری ہی سے تھا
لیکن مجال کیا کہ نماز کا اوّل وقت چوک جائے
نشہ کتنا ہی تیز ہو۔ دھن کیسی ہی مزیدار ہو۔
اُن کے کان اذان کی آواز ضرور سُن پاتے
اور پھر یک دم خاموشی چھا جاتی اور یہ سر
بسجود ہو جاتے۔ گویا ہر حال میں فکرِ عاقبت
دامنگیر رہا۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اور
مزاج میں وہ شگفتگی اور جسم میں وہ توانائی
نہیں رہی۔ لہٰذا اب چوری کی بجائے
ہیرا پھیری ہی پر اکتفا کر لیتے
ہیں۔

پانچواں خط

اگر آپ اسے میری بے پروائی نہ جانیں تو سب سے پہلے یہ عرض کروں گی کہ براہِ کرم اولین فرصت میں چوتھے مکتوب والے دو ایک پرچے اور بھجوا دیجئے ڈاکیہ ابھی انہیں صحن میں پھینک کر پلٹا ہی تھا کہ میرے دو ایک ملنے والے آ گئے اور جاتے ہوئے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایک ایک پرچہ اٹھا لے گئے ـــــ یہی میری پرسوں کے سارے دن کی آمد تھی۔ دیکھ لیجئے ع

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

خدا جانے میں اُس میں کیا انٹ شنٹ ہانک گئی ہوں کہ اب اُلٹی میٹھوں اور دھمکیوں کا سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آپ مجھے اس دردناک جنگل میں پھنسا کر رکھ دیں گے ورنہ کم از کم ہر خط کی نقل ہی رکھتی چلی جاتی اور جواب دیتے وقت ناپ تول سے نہ چوکتی۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس میں یہ چھوٹا منہ کچھ زیادہ ہی بڑی باتیں بک گیا ہے کہ مجھ میں دلچسپی لینے والے قارئین نے بھی شوخی کی بجائے ادب و احترام کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اور بعض تو

میری نام نہاد علمیت سے اس درجہ مرعوب نظر آتے ہیں کہ مجھ سے بعض دیگر دینی و دُنیوی مسائل پر بھی استصواب کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اللہ رے حُسنِ ظنّی،

مجھے آج تک سب سے زیادہ خط رحیم یار خاں سے ایک مرزا صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ اُنہیں شروع ہی سے میری تصویر کا از حد انتظار ہے لکھتے ہیں:-

"میں آپ کا ہر مکتوب پڑھنے کے بعد ایک تصویر ذہن کی تختی پر بنا لیتا ہوں، لیکن آپ کا ہر دوسرا مکتوب اس پہلی تصویر کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دیتا ہے چنانچہ آج میں نے جو خاکہ تیار کیا ہے آپ کا۔ اُس کی رُو سے تو آپ کافی بزرگ معلوم ہوتی ہیں۔ یہی کوئی چالیس کے لگ بھگ، للہ اپنی تصویر لاہور ہیں دے کر مجھے اس پریشانی سے نجات دلائیے"۔

اب ان صاحبزادے کو کیا معلوم۔ کہ اُنکی ہر تصویر فی الواقعہ میرا ہو بہو عکس ہوتی ہے۔ کیونکہ اُن کا ذہن دراصل ان جذبات اور احساسات کی تصویر تیار کرتا ہے جن میں وقتی طور پر بہہ کر یا جنہیں وقتی طور پر اپنے قلب و دماغ پر وارد کر کے میں لکھنے بیٹھتی ہوں لہٰذا سب سچ ہی درست اگر میری حقیقی تصویر منظور رہے اور اسی طرح دُور بیٹھ کر ہی بنانی یا تیار کرنی مقصود ہو تو عرض کر دوں گی کہ میری تصویر بن ہی نہیں

سکتی۔ میری شکل مسخ ہو چکی ہے۔ میرا ذہن معاشرتی حادثوں کی روند میں آ کر بری طرح مسلا اور کچلا جا چکا ہے۔ اور میری روح تو قریباً قریباً اب مُردہ ہے۔ اب بھلا کوئی اس مسخ شدہ مسلے کچلے ڈھانچ کی کیا تصویر تیار کریگا۔"

مرزا صاحب! آپ جس ماحول میں رہتے ہیں۔ وہاں ایک عورت بحیثیتِ عورت صرف ایک ہی "عمر" بسر کرتی ہے۔ ایک ساتھ ذہن کی تابشوں۔ جسم کی توانائیوں اور روح کی بالیدگیوں کو مہ و سال کے جلو میں لئے ہوئے۔ لیکن میرے گھر یہاں کا دستور اس سے قدرے ——— قدرے ہی نہیں ——— بہت کچھ مختلف ہے۔ یہاں کی عورت (اگر اُسے لفظِ "عورت" سے منسوب کرنے پر آپ جزبز نہ ہوں تو) ایک وقت میں۔ ایک ساتھ تین مختلف قسم کی عمریں گذارتی ہے۔ مثلاً مجھے ہی لیجئے۔ چچا ابا کی ڈائری کے مطابق میں صرف تیئیس سال کی ہوں۔ لیکن میرے ذہن کو اس سے دو چند عرصے کے برابر ذاتی حادثات اور معاشرتی نشیب و فراز حفظ ہیں اور میری روح تو شاید سٹھیا گئی ہے۔ اور اب اس کے حواس بھی بجا نہیں رہے۔ اب آپ ذرا غور تو فرمائیے جب ان تین مختلف قسم کے ملگجے پردوں پر کیمرے کی شعبدہ کاریوں کا ملمع ہو گا تو اتنی پردہ داریوں کے بعد بھلا آپ کا تجسس اصل خد و خال کیوں کر دیکھ پائیگا۔

بہتر یہی ہے کہ آپ فی الحال اس خواہش کو بالائے طاق ہی رہنے دیں۔ البتہ
آپ کی دلچسپی کے لئے اتنا ضرور عرض کروں گی۔ کہ میری ہر تصویر میری ظاہری
ہیئت سے یقیناً ہمیشہ بہتر ہی اترتی ہے۔ شاید اس لئے کہ ــــ

دلوں کے رموز کو چہرے کے خدوخال میں ابھار دینے والا کیمرہ ابھی
تک ایجاد ہی نہیں ہو سکا ــــ

اور بے شک اس ہر دفعہ اچھی تصویر اترنے کا میرے کاروبار کی چمک
دمک میں بہت بڑا دخل ہے ،

آپ کے اس دفعہ خطوں کی بجائے محض عتاب نامے ارسال فرمانے کا شکریہ
معذرت طلب ہوں کہ چوتھے مکتوب کو پڑھے بغیر اُن کا جواب عرض نہیں
کر سکتی۔ اور آج محض خانہ پُری کے لئے آپ کو ایک ایسا "رنگین مشاہدہ"
سُناتی ہوں۔ جو اس بازار کی رعنائیوں پر مشتمل ہے۔ اور جس کی میں صرف عینی
شاہد ہی نہیں۔ ایک جیتا جاگتا کردار بھی ہوں۔

اسے وقت کی ستم ظریفی جانئے۔ یا آپ کے ذوقِ تجسّس کی خوش بختی
کہ اگلے دن مجھے اس بازار میں ایک "گھر بی بی کا رُوپ دھار کر جانا پڑا۔
"اُف اک دار" سے کٹے ہوئے آہو کے لیے اس دانستہ فریب کاری

کا تصور بھی کس قدر مسحور کن تھا۔ کہ میں ایک عورت بن رہی تھی، ایک شریف گھرانے کی بہو بیٹی!

میرے عین عقب میں چونگی کے پاس ایک صاحب رہتے ہیں۔ لوگ اُنہیں آغا صاحب کہہ کر اور میں آقا صاحب کہہ کر پکارا کرتی ہوں۔ کیونکہ وہ در اصل آقا و مولا ہیں دس بارہ سگھڑ بیوں کے —— ان کے سودے کرنا۔ انہیں اندھیرے سویرے اپنے نئے زردار طالبوں تک پہنچانا اور دام وصول کرنا۔ یہ سارے جھمیلے یہی کرتے ہیں۔ گویا خاوندوں کے ہوتے ہوئے یہ اُن کے مجازی خدا ہیں۔ ان کے دو ہی مشغلے ہیں لیکن دونوں بڑے کار آمد ہیں۔ سگھڑ بیبیاں سپلائی کرنا اور پولیس کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچانا یوں تو سارے شہر کی تمام اونچی مجلسوں میں ان کا طوطی بولتا ہے لیکن ان دس بارہ "بیگموں" کو تو بس ان کی زندہ جاگیر ہی جانئیے۔

"ان میں سے دو تو خیر سے ان کی اپنی چچا زاد بہنیں ہیں اور باقی نو دس بہت کم گزند آمد اور زیادہ اخراجات والے سفید پوشوں کی بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں ہیں"۔

ان میں سے ایک کو تو سینما دیکھنے کا مرض ہے۔ ایک کو فیشن ایبل سے

فیشن ایبل بہ قطع بدلتے رہنے کا۔ اور ایک کو متعدد قسم کی خوشبوئیں بیک وقت استعمال کرنے کا۔ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ اس کاک ٹیل قسم کے ذوق کی تشنگی بجھانے کے لئے اس بچاری کو کیا کیا پاپڑ نہیں بیلنے پڑتے ہوں گے۔

اُس دن اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ سارا مال کھپ گیا۔ ادھر مارکیٹ میں بیوپاری اتنا نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ شاید انتخابات کی ہماہمی کے باعث ہو۔ ادھر اچھے دوکاندار کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ بہرصورت اپنے سٹاک کے ختم ہو جانے کی منحوس خبر زبان پہ نہ لانے پائے۔ کیونکہ یہی "بھرم" بالآخر کاروبار کی وسعتوں کا ضامن ہوتا ہے اور دوسری طرف ہوٹل والے کا تقاضا تھا۔ کہ صاحب کو ان کے معیار کی کوئی چیز ملنی چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وعدہ وعید کے بعد بیوی نے کہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آغا صاحب میرے کوٹھے پر آ دھمکے۔ اور کچھ اپنی مجبوریوں کا واسطہ دے کر اور کچھ کاروبار کا بھرم رکھنے کی التجائیں کر کے مجھے ساتھ جانے پہ آمادہ کر لیا۔

جب تک بات طے پائی بارہ ہو لئے تھے۔ اب گویا ہمارا بازار کا ملا مردہ پڑا ہُوا تھا۔ یعنی کہ ڈوموں اور میراثیوں کے دن اور رات بُری طرح جھنجھنا رہے

ہوئے ستارے کے تاروں کی نگاہوں پر بھی خُنکی مسلط ہو چکی تھی۔ کہ

"میں گردن کے پاس سے چھ چھ انچ گھیر کا نفیس ریشمی کاڑھا ہوا برقعہ آدھا

ترچھا پہن، کہ معطر بالوں کو کالی گھٹا کی مانند بے طرح بائیں شانے پہ بکھیرے

ہاتھ میں پرس سنبھالے کوئی بارہ بج کر بارہ منٹ پہ ہوٹل کے صحن میں بیوک

سے اُتری"۔

آغا صاحب کار خود چلا رہے تھے لیکن وہ اپنی سیٹ سے ذرّہ بھر نہ ہلے۔ بلکہ محض ایک شریف ڈرائیور بن کر بیٹھے رہے جس کی سواری کو اتارنے کے لئے آگے بڑھ کر ہوٹل کے بوڑھے مالک اور مینیجر نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اور پھر شاید بیوک اور بیوک کے مالک، آغا صاحب دونوں ہی واپس پر ساڑھے تین بجے کا الارم سرہانے رکھ کر اپنے اپنے گیراج میں جا کر سو گئے۔

ہوٹل کے یہ مالک اس مالکیت سے پہلے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ اور ہندو طبلچی کی روایت کے مطابق نوکری کے زمانے میں بھی بڑے نیک، پارسا اور نمازی تھے۔

"گو سماعت کا چسکا اور کوٹھوں پر جانے کا لپکا ——— حوالداری ہی سے

تھا۔ لیکن مجال کیا کہ نماز کا اوّل وقت چُوک جائے۔ نشہ کتنا ہی تیز ہو۔

دُھن کتنی ہی مزے دار ہو۔ ان کے کان اذان کی آواز ضرور سُن پاتے۔ پھر

یک دم خاموشی چھا جاتی۔ اور یہ سر بسجود ہو جاتے!

گویا ہر حال میں فکرِ عاقبت دامنگیر رہتا۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں اور مزاج

میں وہ پہلی سی شگفتگی اور جسم میں وہ توانائی نہیں رہی اور نہ وہ چاندی کی ریل

پیل ہی میسّر ہے۔ لہٰذا اب چوری کی بجائے ہیرا پھیری ہی پر اکتفا کر لیتے

ہیں۔ آخر مجبوری ہی کا تو دوسرا نام صبر ہے۔ گویا اب اُن کے حلئے کی طرح

ان کے مشاغل کے نقوش بھی مسخ ہو چکے ہیں۔ ـــــ اور اُن کا ہوٹل صرف

ہوٹل ہے یا صرف قحبہ خانہ اس میں تمیز کرنا بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے ـــ

اللہ رے روحانیت و نجاست کا ملاپ ـــــ!

اور اب لگے ہاتھوں جملہ معترضہ کے طور پر اُن ذات شریف کے کوائف

بھی سُن لیجئے۔ جنہوں نے مجھے بزعمِ خویش ایک اعلیٰ سوسائٹی گرل جان

کر آغا صاحب کو بیعانہ اور خرچہ یکمشت ادا کر کے بھیجا تھا۔ ان آغا صاحب

ہی کی زبانی۔

آغا! کوئی ساڑھے گیارہ کے قریب بڑبڑاتے ہوئے میرے

کمرے میں داخل ہوئے۔ اور اپنی فیلٹ کو میرے قدموں پہ دے مارتے ہوئے بولے:۔

"بی بی! خدا کے لئے آج میری لاج رکھ لو۔ کوئٹہ سے سینما والا پٹھان آیا ہوا ہے۔ وہی جو اس دن زرینہ کے ہاں سے گانا سنتے سنتے ایک سو کا نوٹ کتے کے سامنے ہڈی کی طرح پھینک کر چلتا بنا تھا۔ زرنہ کی رعونت میں۔

"میں خود گا سکتا ہوں اس سے بہتر ۔۔۔ طلعت میرا ہی تو شاگرد ہے" گدھا کہیں کا۔ اِن دنوں ہر پیسے والا تان سین بنا پھرتا ہے جیسے یہ فن اتنا ہی عام ہوا سے کیا خبر کہ اس کے لئے تو زندگی وقف کرنی پڑتی ہے زندگی!" (یہ آخری دو فقرے اس نے محض از راہِ خوشامد کہے تھے۔ ورنہ گانے کے متعلق آغا جی کی معلومات بھی نہ ہونے سے ہرگز زیادہ نہیں ہیں) ۔۔۔۔ بارہ تو بج ہی گئے۔ پانچ کی گاڑی سے وہ جا ہی رہا ہے صبح کوئٹہ میں تار بھی جا چکا ہے اس کی جذباتی سا تو ٹھا ہے۔ اتنی دیر تو تم ہی بن میں الجھائے رکھو گی"۔ اور پھر آغا نے ایک سو کے نوٹوں کی ایک گٹھی میرے تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا: "اگر جھڑے میں آ گیا تو پو بارہ ہو جائیں گے

چلو میری بہن۔"

اور یوں ایک بہن کو اس مُنہ بولے بھائی کی مجبوری نے بالآخر رام کر ہی لیا ــــ "اور دیکھو" ــــ آغا نے پلٹ کر مجھے خاص ہدایت کرتے ہوئے کہا ــــ بس اتنا خیال رہے کہ ذرا نیا نیا امیر ہے۔ شاید الاٹمنٹ کا امیر ــــ!"

اور میں بالکل غیر شعوری طور پہ ایک رنڈی سے عورت بن کر اس بازار کی جانب رواں ہو گئی ــــ کار سے اُترنے کے بعد ایک نہایت ہی مؤدب ادھیڑ عمر کے بیرے نے صحن سے شہزادے صاحب کے کمرے تک میرا ساتھ دیا۔ کمرے کی جلتی ہوئی برقی مشعلیں اُن کے سراپا انتظار ہونے کا یقین دلا رہی تھیں۔ میں نے اندر داخل ہونے سے پہلے دریچے میں سے جھانک کر دیکھا۔ حضور بُری طرح محوِ آرائش تھے۔ اور جس وقت میری پہلی نظر پڑی بغلوں میں پاؤڈر اور لونڈر لگانے میں مصروف تھے ــــ ہائے انسان دل اور روح کے گند کو چھپانے کے لئے کیا کیا کچھ نہیں کرتا ــــ اتنے میں بیرے نے انگشتِ شہادت سے ہلکی سی ٹک ٹک کی اور خود صاحب کو دروازے کی طرف لپکتا دیکھ کر واپس لوٹ گیا: اور پھر اگلے ہی ثانئے میں ــــ ایک بھاری بھرکم غیر متناسب الجثہ انسان قسم کا ڈھانچ میرے سامنے تھا۔

زرد زنفہ سے چہرے کے نہ ختم ہونے والے جبڑے پھیلائے ہوئے ہکتی
ہوئی بنیان نمایاں کئے۔ ڈریسنگ گاؤن کے بٹن کھولے اور رات کا ریشمی
پائجامہ زیب تن فرمائے ہوئے اوپری دولت کی چربی رخساروں تک چڑھ آئی
تھی۔ جس سے حریص نگاہیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور سانولی پیشانی کے ہر
طرف تین تین انچ دُور کہیں بالوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔

مجھے دیکھتے ہی بس ریشہ خطمی سے ہو گئے۔ اور ہمارے ہی بازار کا یہ
گھسا پٹا شعر تحت اللفظ ادا فرمانے کے بعد مجھ پر ایک اوپرا سا قہقہہ نچھاور
کرنے کی کوشش کی ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

گویا یہ اُن کا گھر تھا۔ اور میں بھی محض شوقِ ملاقات ہی سے چلی آئی تھی یہاں
——میں نے "شکریہ" کہہ کر دہلیز کے اندر قدم رکھنے کی کوشش کی تو
بڑی بے تکلفی کے ساتھ میری پیشانی پر بوسہ دے کر کہنے لگے:
"حضور اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ مجھے صدقے تو اتار لینے دیجئے پہلے ——
اور پھر—— "اُف برف ہو رہی ہے یہ چاند سی پیشانی" کہہ کر ہیٹر کا سوئچ

اَون کرنے کے لئے لپکے اور میرے سامنے کی کرسی پر عجیب قسم کی مضحکہ خیز نیاز مندانہ حیثیت سے بیٹھ گئے اور سلسلۂ کلام کا افتتاح رفتہ رفتہ یوں ہُوا

وُہ :- آپ کیا پئیں گے چائے یا کافی —— یا . . . یا —— ؟"

میں :- کچھ نہیں شکریہ آپ کا"

وہ :- کچھ تو پیجئے گا حضور!

میں :- "واللہ مجھے ہرگز پیاس نہیں ہے"

وہ :- "حضور! میرے دل میں اگر ضمیروں کو خیرباد کہہ کر بھلا کبھی نام سے خطاب کرنے کی اُمنگ پیدا ہو تو . . . . تو"

میں :- "میرا نام رضیہ سُلطانہ ہے اور آپ کا اسمِ گرامی ؟"

وہ :- "میرا نام عارف ہے"

(مجھے یقین ہے کہ انہوں نے بھی میری طرح نام ضرور غلط ہی بتایا ہو گا)

میں :- آپ کی بے حد تعریف سُنی ہے (میں نے اُن کی پھڑکتی ہوئی رگ کو کھجلانے کی کوشش کی)

وہ :- "نہیں! میری رُوح! تعریف کیسی ؟ میں ناچیز کس لائق ہوں میں تو

غریب انسان ہوں۔ اور غریبوں کی کیا تعریف ہوتی ہے۔ بس غریب!
بلوچستان میں ایک چھوٹا سا تعلقہ ہے۔"

"کوئی دو تین ہزار ایکڑ کا" میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

"بس آپ کا کرم ہے، آپ جاننے کے باوصف کُرید رہی ہیں۔ ایک سینما ہے اور ایک مختصر سا کارخانہ۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ رازق دال روٹی دیئے جا رہا ہے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑی آج تک۔"

میں:۔ "اور نہ اس طرح بکنے بکانے کی" ــــ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ:۔ (حیران سے ہو کر) حضور! یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ اور میری کس گستاخی کی سزا ہے یہ۔ بکنا اور خریدنا تو ایک طرف میں تو آپ کے ایک ایک قدم پہ قربان ہو جاؤں۔ للہ ایسا بُرا خیال دل میں نہ لائیے میں تو خود نقائص کا پُتلا ہوں یہ اللہ کا ترس ہے کہ میرے عیوب ڈھکے ہوئے ہیں۔

"دراصل مجھ میں ایک نقص ہے۔ میں اکیلا سفر نہیں کر سکتا۔ سفر میں اکیلا سو نہیں سکتا۔ اور بیگم بیچاری ہر سفر میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ گھر میں تو اُن کا پلنگ عین میرے پہلو میں رہتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ میرے!

میرے دماغ کو چسکا سا لگ گیا ہے۔ سوتے وقت عورت ذات کی لطیف گفتگو سننے کی۔ بیماری جو ٹھہری۔ اور ایسی بیماری جس کا علاج اپنے بس میں نہیں"۔

یقین مانئے محض اسی دکھ کے علاج کے لئے آپ کو زحمت دی ہے

"اُوہ آپ کتنی حساس ہیں"۔

اور پھر میرے ہاتھوں کی پوروں کو اپنے ہاتھ میں لیتے اور انہیں نرمی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مس کرتے ہوئے بولے جیسے کوئی تقدیر دیکھ رہا ہو۔

"یہ بیرا میری طبیعت سے واقف ہے۔ اُس نے آتے ہی ایک پیش کش کی تھی۔ لیکن میں نے اسے ویسے ہی بیس روپے دے دیئے اور کہا نہیں"۔

"ہم اپنے مقدر کی تلاش میں ہیں۔ شاید کہیں مل جائے ۔ اور پھر حضور!" ـــــ انہوں نے میرے ہاتھ کی ہتھیلی پر دو انگارہ سے کالے ہونٹ چپکاتے ہوئے کہا ـــــ:

"اور پھر آج میری تقدیر مجھے مل گئی ہیں کتنا خوش قسمت ہوں"۔

اور پھر یک دم چونک کر فرمایا۔

"آپ کی تنخواہ کیا ہے؟"

میں :۔ صرف ایک سو روپیہ۔ اور سارا دن پڑھنے پڑھانے کا دھندہ۔

اور ایک آٹھ افراد کے کنبہ کی ذمہ داریاں"۔

وہ :۔ "اُف۔ کتنا ظالم ہے یہ سماج اس ہیرے کی قیمت صرف ایک سو روپیہ

ڈالی ہے جس نے ——

"اُس اَن داتا کے بھی وارے نیارے جائیں کسی کو اتنا دے دیتا ہے کہ

وہ حساب ہی نہیں رکھ پاتا۔ اور کسی مستحق کو اتنا قلیل دیتا ہے کہ حساب رکھنے

کی نوبت ہی نہیں آتی" ——

"میرے خیال میں تو وہ جب ایک آدمی کو اُس کی احتیاج سے زیادہ دیتا

ہے۔ تو اُس میں دوسرے گھرانوں کے پلنے کا راز پوشیدہ ہوتا ہے"۔

میں :۔ شاید یہی مصلحت ہو"

وہ :۔ نہیں یقیناً یہی ہے۔ اسی باعث میں تو جب بھی کبھی کسی سفر پہ جاتا

ہوں تو میرا ہوٹل والوں سے عموماً یہی تقاضا ہوتا ہے کہ بس شب کا ساتھی

ایسا ملے جو غریب ہو۔ غریب الطبع ہو شریف گھرانے کا ہو تاکہ مجھے کسی

شریف کی خدمت کا موقع مل سکے"۔

میں :- "جی !"

وہ :- اب دیکھئے نہ زمانہ میں نہیں پڑھتا۔ زکوٰۃ کی بھول چوک عموماً مجھ سے ہو جاتی ہے۔ بس اسی طرح کچھ ہے۔ اگر خلقِ خدا کی خدمت کا بھی موقع مل جائے

میں :- (زیرِ لب) سبحان اللہ کیا جواز ہے ان ناجائز حرکات کا"۔ اور

اور میرے الفاظ سنتے ہوتے انہوں نے آگے کو جھک کر ایک بچنہ کا کھلاڑی کی طرح ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا چہرہ اوپر کو اٹھایا! اور کہا۔

وہ :- حضور! اتنی چپ بھی تو خوب نہیں

میں :- نہیں میں آپ کی ساری گفتگو سن رہی ہوں۔

وہ :- مگر یہ چہرے پہ غم و غصہ کی لہر کیوں نہ ہے ؟

میں :- یونہی ہے۔ آپ نے جو ذرا تفصیل سے بات کی تو میری آنکھوں میں گھر کی حالت زار پھر کر رہ گئی۔

وہ :- اُف توبہ! ایک پیاری سی جان اور اتنے غم لیکن اتنا غم بھی کیا

میرے پاس جو ہے وہ سارا آپ ہی کا تو ہے۔ بھلا ان یاقوتوں کی

کوئی قیمت ہو سکتی ہے۔ ذرا اُنہیں جُنبش تو دیجئے۔ پھر دیکھئے ——

جان و دل کِس نازفتگی سے نچھاور ہوتے ہیں"۔

اس پر میں نے ذرا اور مُنہ بسورتے ہوئے آنکھوں میں جھلی تارے

جھلملانے کی کوشش کی تو آپ نے بڑھ کر میری آنکھیں چُوم لیں۔

"اور اگر میں عین وقت پر غسل خانہ میں جانے کا بہانہ نہ کرتی تو بس

اُن کی دست درازیوں کو پَر لگنے ہی والے تھے"

غسل خانے میں جا کر میں نے دیکھا۔ ایک طاقچہ میں دو بوتلیں پڑی

تھیں۔ ایک پر "دوآتشہ نارالِلحم" اور دوسری پہ گولڈ ربن بئیر کا لیبل چسپاں تھا

گویا اس نئے امیر کو برف میں آگ جل کر کے بھی پینے کی لت تھی۔ میں نے غسلخانہ

میں دیر لگا دی اتنے میں مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی آرائش کی نوک پلک کم از کم تین

چار دفعہ ضرور دیکھ چکے ہوں گے۔

میں باہر نکلی تو اُن کے رُخ پر بے تکلّفی کی گھنی پہ چھائیاں پھر یریاں لے

رہی تھیں۔ اور مجھ سے گھُل مل جانے کی مسرّت نما اشتہاء اُن کی باچھوں سے

پھوٹی پڑتی تھیں۔ سامنے آتے ہی دُہی امیر و غریب کا فرسودہ موضوع پھر

شروع ہوگیا اور بالآخر اُن کی امیرانہ دلداریوں کی تان یہاں آکر ٹوٹی۔

"میں تو عموماً دعا مانگا کرتا ہوں کہ میرا خدا بروزِ حشر مجھے غریبوں ہی کے زمرے میں سے اٹھائے۔

اور پھر غربا نوازی کا بیّن ثبوت بہم پہنچاتے ہوئے انہوں نے دس دس کے دو نوٹ میری اصل خرچی کے علاوہ زبردستی میری انگیا میں ٹھونس دیئے اور اس کے بعد کوئی اڑھائی تین بجے کے قریب جب بادۂ الحم اور ربڑ کا عطا کردہ ٹھنڈا جوش اُترا اور اُن کے قوائے ذہنی پر خواب کا کسل طاری ہوا تو وہ بے تحاشا اور نہ ختم ہونے والے خراٹوں کی ہنگامہ خیزیوں میں بہہ گئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اِس کے بعد اُس نے ساڑھے چار بجے تک کروٹ تک لینے کی توفیق عطا نہ فرمائی۔ ادھر میرا سر پنکھے کے چکّر گنتے گنتے چکرانا شروع ہوگیا تھا۔ حتیٰ کہ الارم نے چیخ چیخ کر ساڑھے چار کا مژدہ سُنایا نیچے سے "بیوک" کا ایک نیم بیدار سا ہارن بھی بلند ہوا۔ اور وہ اپنا اوپر بیداری اور میں جعلی غنودگی طاری کر کے اُٹھ بیٹھی۔ پلنگ سے اُٹھتے ہی انہوں نے مجھے عجیب رسمی سے انداز میں پیار کرتے ہوئے کہا:-

"رضی! تم مجھے بھولو گی تو نہیں؟"

اور میں نے اپنی مخصوص الوداعی مسکراہٹ ہونٹوں پہ پھیلاتے ہوئے جواب دیا "کہیں آپ کو بھولا بھی جا سکتا ہے"۔

چند منٹ اور گزرے تو بیرا سامان باندھنے کے لئے آ کھڑا ہوا اور میں اُن کی غریب پروری کا دل ہی دل میں تجزیہ کرتی ہوئی بیوک کی اگلی سیٹ پہ آ بیٹھی۔ واپسی پہ جو خنک ہوا، آنکھوں۔ پیشانی اور کانوں سے ٹکرائی۔ تو نیند کے خمار نے اس کرب آمیز تجزیے تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور میں گھر تک آغا صاحب کے ہزار تقاضوں کے باوجود اس شخص معلوم کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

- اتنا بُرا آدمی نہیں ہے
- محض غریب پروری کے لئے عیاشی کرتا ہے بچارا!
- واقعی! جہنم کا سارا راستہ نیکی کے پتھروں ہی سے بنا ہوا ہے!

(ز۔ ج۔ گ)

چلئے ——— میں محبوب نہ سہی۔ لیکن وہ تو خلقِ خدا کے محبوب ہیں۔ اور حبیبِ خدا کے نام لیوا بلکہ اُس کی چھوڑی ہوئی مقدس امانتِ تہذیب واخلاق کے پہلے اور آخری وارث بھی! اُن کی رفتار و گفتار میں کچھ تو رس ہونا چاہیئے۔ وہ دُنیا و جہان کو شفائیں بخش دینے والا رس نہ سہی لیکن گفتگو میں رچا ہُوا اس قدر زہرِ ہلاہل بھی تو وارثانِ انبیاء کی شان کے شایاں نہیں!

چھٹا خط

مدیرِ محترم! اللہ ان رہبرانِ ملّت کو تھامئے۔ یہ کیوں پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ آخر میں نے انہیں کہا کیا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ میرے مُنہ سے کوئی غیر معقول بات نکل بھی گئی ہے تو انہیں کہیئے دلائل سے کام لیں۔ دعوئے بغیر دلیل چہ معنی دارد۔ آپ نے ضرور میرے چوتھے مکتوب والے تبصرے پڑھ کر بھجوائے ہوں گے۔ کیا انہیں پڑھ کر آپ کے کچھ پلّے پڑا۔ اور اگر آپ بہ ایں علم و دانش ان سے کچھ استفادہ نہیں کر سکے تھے۔ تو جناتی زبان کے یہ شاہکار میری طرف کیوں ری ڈائرکٹ کر دیئے آپ نے۔ میرے لئے تو اس آپ بیتی یا جگ بیتی پہ ہلکا پھلکا تبصرہ کرتے رہنا بھی کوئی کم مشکل امر نہیں ہے۔ اب یہ۔ کہ میں سارا سارا دن فیروز اللّغات سے کہ ان نئی نئی مغلظ اور دقیق اصطلاحوں کے معانی بھی تلاش کرتی رہا کروں۔ یہ بھلا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔

آپ یقین جانیں کہ بعض خریطہ ہائے شرعی کے تو متواتر پار چار

ورق پڑھ جانے کے بعد ذہن کسی ایک فقرے کا مفہوم سمجھنے نہیں پایا۔
میرے خیال میں تو ان حضرات کا یہ انداز تخاطب و تحریر محض اصل بحث
سے گریز کے باعث ہے اور محض گم کردہ راہ کو صحیح منزل پہ پہنچانے کی بجائے
کج بحثی بلکہ نافہمی کی بھول بھلیوں میں اُلجھا دینا مقصود ہے ورنہ اگر مقصد اصلاح
احوال اور تبلیغ حق ہوتا تو لازم تھا کہ وہ کوئی ایسا انداز اور کوئی ایسی زبان
زور استدلال کے لئے انتخاب فرماتے جسے میں کم از کم سمجھ ہی سکتی۔ اور جو
ایک مبلغ کے شایانِ شان بھی ہوتی۔ ایک اجنبی سے روشناس ہونے
یا اُسے اپنے آپ سے روشناس کرانے کے دو ہی طریقے ہیں کہ یا آپ
اُس کی زبان میں گفتگو کریں یا وہ آپ سے آپ کی زبان میں مخاطب ہو یا
پھر دونوں کسی ایسی زبان میں بات چیت کریں جو دونوں کے لئے قابلِ فہم
ہو اور جس میں دونوں اظہار مافی الضمیر کی قدرت رکھتے ہوں۔ مجھے اُنہی
حضرات کرام کے سر کی قسم میرے تو کچھ پلّے نہیں پڑا۔ سوائے ان چار الفاظ
کے خبیثہ۔ مردودہ۔ ملعونہ۔ اور جہنمی بس یہی الفاظ اس پلندے کے
ہر ورق کے ٹیپ کے مصرعے ہیں۔ اور میں تو یہ بھی کہوں گی یہ الفاظ بھی
اس حُسن سے استعمال نہیں کئے گئے۔ جس حُسن سے استعمال کئے جانے کی

اُن میں گنجائش اور صلاحیت موجود ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ لوگ محبوب کو کافر۔ قاتل۔ سفاک۔ دغاباز۔ ظالم اور بے وفا قسم کے نازیبا ناموں سے یاد کرتے رہتے ہیں لیکن خطاب کا انداز کچھ اس رُخ سے ہوتا ہے کہ اُس وقت اس سے بہتر حسین لفظ ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور محبوب کا بھی دل چاہتا ہے کہ وہ بار بار اپنے لئے وہی الفاظ سُنے ——

چلئے ہیں محبوب نہ سہی لیکن وہ تو خلقِ خدا کے محبوب ہیں۔ اور حبیبِ خدا کے نام لیوا بلکہ اُس کی چھوڑی ہوئی مقدس امانت کے پہلے اور آخری وارث بھی! اِن کی رفتار و گفتار میں کچھ تو رس ہونا چاہیئے۔ وہ دنیا و جہان کو شفائیں بخش دینے والا رس نہ سہی لیکن گفتگو میں رچا ہوا اس قدر زہر ہلاہل بھی تو وارثانِ انبیاء کی شان کے شایاں نہیں۔

انہیں تو تسلیم ہے بلکہ تسلیم سے بھی کچھ آگے کہ وہ مجھ کو ایک گھٹیا اور ذلیل ترین عورت قرار دیتے ہیں اور میں خود تسلیم کرتی ہوں کہ اُن کی رفیع شان کے مقابلہ میں تو میرا مقام شاید پوری طرح گھٹیا کا بھی نہیں۔ لیکن

اگر وہ صرف گالیاں ہی عطا فرماتے چلے گئے اور میں اس ذلت کے باوصف جواباً عرض لجاجتیں اور التجائیں ہی کرتی چلی گئی

تو ہمارے قاری اور سامع اس تفریق مدارج کی تہ تک کیونکر
پار پہنچ سکیں گے؟"
کہیں وہ بچارے بھٹک کر "حفظِ مراتب" کی زد میں نہ آجائیں۔
مجھے ڈر ہے۔

(ز۔ ج۔ گ)

لیکن رئیس زادے کو کیا معلوم!
کہ اگر ایک مستقل دوکاندار ککنگوں پر اپنا
وقت ضائع کرنے لگے اور اپنے کاروبار
کو ٹورنگ (گشتی) بنالے۔ تو اڈہ کی قیمت
کم ہو جاتی ہے —— پھر سو روپیہ
روزانہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ——
خیر اس سے یہ تو اندازہ ہو سکتا ہے
کہ اس آپ کے بازار کی عورتیں جب
اس قسم کی ہائی کلاس ککنگیں کرتی ہیں تو اُن
کی فیس زیادہ سے زیادہ کیا ہوتی ہے
اور ابھی تو اس صاحبزادے نے جو
میری یہ فیس مقرر کی ہے اُس میں
اُن کا جذبۂ ترحم بھی شامل ہے۔

ساتواں خط

چوتھے مکتوب والے پرچے مل گئے۔ پڑھ لئے اور کسبِ سکون کر چکی۔ معلوم ہوتا ہے یہ خفگی۔ ناراضگی اور قہر محض ہارے ہوئے جواری کا انتقام ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اور پھر میں نے تو آخر میں اپنی جوشِ خطابت کی لغزشوں کو واپس بھی لے لیا تھا۔ اُن پر اظہارِ ندامت بھی تو کر دیا تھا۔ اب کسی کے لئے تعزیر و تادیب کی گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی؟ خط لکھنے بیٹھی تو خیال تھا کہ "اِس بازار" کا کا ایک ایسا واقعہ آپ کو سناؤں گی جیسے اِک ناک دن سنانے ہی کے لئے میں نے یہ سلسلۂ مکتوبات شروع کیا تھا۔ لیکن آج اُس سے بھی کہیں دلچسپ موضوع نوکِ خامہ کی بلائیں لے رہا ہے اور وہ ہے اُن کوٹھے والے ذاتِ شریف کا "محبت نامہ" یا اظہارِ تعشق و اشتہا کا مرقع" جو مجھے آج صبح کی ڈاک کے ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوٹل کے مینیجر صاحب کی وساطت سے ملا ہے۔ "یہ حقیر ساعریضہ" یہ محبت بھری التجاؤں سے معمور "چیتھڑہ" (راقم نے اسے ایک دو دفعہ خود ہی ان ناموں سے یاد کیا ہے) صرف ساڑھے تیرہ[۱۳]

صفحوں پر مشتمل ہے۔ کارٹون والا صفحہ جسے اس خط کا پیش لفظ کہنا بے جا نہ ہوگا اس کے علاوہ ہے۔ آپ لفظ کارٹون سُن کر حیران ہو گئے ہوں گے لیکن وہ یہ قلمی تصویر جو اس خط کے پہلے صفحہ پر ثبت ہے واقعی کارٹون نما ہی ہے۔ قلم سے آڑی ترچھی کھنچی ہوئی۔ رنگوں سے یعنی گوشت کے نمود سے بے نیاز۔

اس تصویر میں ایک عورت کو ایک خوشنما پلنگ پر لیٹا ہوا دکھایا گیا ہے اس طرح جیسے کوئی عورت دردِزہ کے عالم میں ہو۔ پھر اس کے جسم میں سے ایک بچہ نکلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پاس خود "شہزادہ صاحب" کھڑے ہیں۔ کندھے پر شیروانی ڈالے ہوئے اور اپنے کسی خیال میں مست اس منظر حسین کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ تصویر کے اوپر کاغذ کے عین وسط میں لکھا ہوا ہے "میری دعا"۔ گویا یہ کارٹون میری دعا ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ذاتِ شریف کس قماش کے ذاتِ شریف ہیں اور مجھ سے جُدا ہونے کے بعد آپ نے تصوّر تصوّر ہی میں مجھ سے کن کن رُخوں سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ انا للہ!

ساڑھے تیرہ صفحے تو نقل کرنا خیر جان جوکھوں کا کام ہے

لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کو اُس خط کا محض خلاصہ ہی سُنا کر اُس خط کے اصل "تاثر" کا گلا گھونٹ دُوں۔ لہٰذا جستہ جستہ اُس کے کچھ اقتباس انہی کی زبان میں ملاحظہ فرمائیے۔

"میری راحت کا سرمایہ رضی! اپنے ایک ناچیز لیکن مخلص غلام کا ہدیۂ سلام قبول کرو۔"

آغاز اِسی تذلّل اور انکسار سے ہوا ہے۔ اب نفسِ مضمون کی طرف رجوع فرمائیے۔ اور اِس "میری دعا" کا شانِ نزول اُن کے الفاظ میں سُنئے:۔

"خط کے آغاز پہ ایک خاکہ سا ہے۔ پیارے اس پہ یونہی نظر ڈال کر ٹال نہ دینا۔ یہ اُس دنیا کا نقشہ ہے جو میں بسانا چاہتا ہوں آپ سے مستقل طور پہ وابستہ ہو جانے کے بعد۔ میری صحت۔ میری دولت۔ میری تعلقہ داری۔ یہ کارخانہ اور یہ سینما۔ ان سب کی آمد اور آپ کا حُسن۔ حوروں کو شرما دینے والا حسن۔ اور آپ کا ذہن۔ غریبوں کا ہمدرد۔ دکھیوں کا حامی۔ آپ سوچیئے تو ان دو روحوں اور جسموں کا ماحصل کتنا ذہین۔ کتنا پیارا اور کتنا

امیر الطبع ہو گا۔"

پھر ایک جگہ اُسی یادِ رفتہ کو جھنجھوڑتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

" نہ آپ سگرٹ پیتی ہیں نہ وسکی نہ بیر نہ ماء اللحم۔ آپ زندہ کس طرح ہیں۔ مجھے تو زندگی میں کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو ایسے شغل نہ کرتی ہو۔ بلکہ بعض تو ہم مسافروں کے پاس آتی ہی اسی غرض سے ہیں کہ چلو کچھ دیر نمک تیل کے فکر سے جان چھوٹ جائے گی۔ ایک آدھ پکچر ہو جائے گی دو ایک دَور کسی لطیف شراب کے چل جائیں گے۔ مجھے بتاؤ تو سہی کون سا گھُن آپ کے حسین ذہن کو لگ گیا ہے جو اس عمر میں بھی لطف نہیں اُٹھانے دیتا۔"

اور اب ذرا اس داشتہ پن کو عارضی طور پر مستقل کرنے کی ایک تجویز ملاحظہ فرمائیے اُف بیویوں والے عیاشوں کو اپنے ذوقِ تعیش کی تسکین کے لئے کیا کیا۔ اہتمام و احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

" کیا آپ میرے ہاں نہیں آسکیں گی۔ اب تو سکولوں میں ویسے بھی چھٹیاں ہو چلی ہیں۔ آپ اپنی سہیلی کے ہاں بھی تو چند روز

کے لئے چھٹیاں گذارنے جا سکتی ہیں۔ کم از کم بیس پچیس دن،
اگر آپ آنے کی منظوری دے دیں تو میں یہاں سے اپنا ایک دوست
بھیج دوں گا جو آپ کو کوئٹہ سے چار پانچ اسٹیشن ورے سے ہی مل جائیگا
میں نے اپنی بیوی سے تو احتیاطاً کل ایک خط دکھا کر پہلے ہی سے
کہہ دیا ہے کہ میرے ایک دوست معہ بیوی چھٹیاں گذارنے کے
لئے آرہے ہیں۔ آپ کے لئے بیرونی دیوان خانہ خالی کرایا جا رہا ہے
آپ وہیں آرہئیے گا۔ اور پھر ہم جی کھول کر آپکے موضوع پر گفتگو
کرسکیں گے۔ مجھے آپ کی خدمت میں اپنا دل پیش کرنے کا موقع
مل سکے گا۔

خدشہ مجھے اپنی تیسری بیوی کا تھا۔ جس سے نکاح سے پہلے اسی
قسم کی ایک حرکت ہو گئی تھی سو وہ کل اپنے میکے جا رہی ہے۔"
آئندہ چل کر اس دیوان خانے کے قیام میں مجھ سے عشق و عاشقی
کی پینگیں بڑھانے کی فیس کا ذکر ہے۔

"آپ کی سیٹیں فرسٹ کلاس کی اُسی دن ریزرو کرادی جائیں گی۔
جب آپ کا خط آئے گا۔ اور رہائیسی پر ہر ریزرو کا سو روپے کے

حساب سے نذر کر دوں گا۔ یہاں کے مصارف میرے ذمّہ۔

اور آخر خط میں دیوان خانے میں پہنچ کر جو احتیاطیں ملحوظ رکھنا ہونگی اُن کا ماحصل سنئے:۔

"آپ اس دوران میں میری دونوں بیویوں کو یہی بتائیں گی کہ آپ سرحد سے آئی ہیں۔ آپ کے والد ایک بہت بڑے اوورسیر ہیں۔ آپ کے دو بچے ہیں۔ آپ کو مطالعہ کا بہت زیادہ شوق ہے اسی لئے آپ سارا سارا دن اور ساری ساری رات پڑھتی رہتی ہیں، اور آپ کے میاں پڑھاتے رہتے ہیں، آپ ایم اے کی تیاری کر رہی ہیں، اسی لئے گھر میں کم آتی جاتی ہیں۔"

"اپنی دونوں بیویوں کو پیش کرنے کے لئے کچھ چیزیں اور اُن کے بچوں کے لئے کپڑے میں ارسال کر دوں گا یا وہ میرا دوست لے آئے گا۔"

میں نے اس خط کو بھی اپنے چوتھے مکتوب کی طرح کوئی چار پانچ دفعہ سے کم نہیں پڑھا لیکن رئیس زادے کو کیا معلوم اگر ایک مستقل دوکاندار پکنکوں پر اپنا وقت ضائع کرنے لگے اور اپنے کاروبار کو ٹورنگ گشتی،

بنالے تو اڈے کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ پھر سو روپیہ روزانہ۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ خیر اس سے یہ اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ اس بازار کی عورتیں جب اس قسم کی ہائی کلاس بکنگیں کرتی ہیں تو اُن کی زیادہ سے زیادہ فیس کیا ہوتی ہے۔ اُدھر ابھی اس صاحبزادے نے جو میری یہ فیس مقرر کی ہے اُس میں تو اُن کا جذبۂ رحم بھی شامل ہے۔ میری غریبی کا تاثر میری آٹھ افراد کی ذمہ داریوں کا خیال۔ اگر آئندہ خط میں چوک بھی جاؤں تو یاد کرائیے گا۔ اِسی بازار کا ایک اور واقعہ آپ کو سناؤں گی جس سے پتہ چلے گا کہ میرے ماحول میں عورت کا جس بری طرح گوشت نچا ہے۔ اِس بازار میں اُس کی اس سے کہیں بُری طرح دُرگت بنائی گئی ہے۔ اس سے کہیں بے دردی کے ساتھ۔

(ذ۔ ج۔ گ)

لیکن خُدا محفوظ رکھے! ـــ اس
بازار کے تعیّش پسند مجاہدینِ ملت اور
غازیانِ قوم سے جن کی کڑک سے محراب و
منبر بھی لرزتے ہیں۔ اور جن کی ضمیر کے
گھناؤنے پن سے قحبہ خانوں کے بھبکوں
میں بھی اضافہ ہوتا ہے ـــــ وہ رضاکارانِ
دلیر جن کے کندھوں کے ہلالی بیج دیکھ کر
بڑے بڑوں کا طنطنہ سرنیوڑھا دے
لیکن آخر شب نگار خانوں میں جن کی
ذلّت کو دیکھ کر یوں بھی محسوس ہو۔ جیسے
کم از کم اس ڈھانچ کی تعمیر میں خدا کی
بجائے اس کا مدِمقابل زیادہ دخیل
تھا۔ اور اس خمیر کو وجود دے کر اس
کا اصل سانچہ بھی ریزہ ریزہ کر دیا
گیا ہے۔

آٹھواں خط

لیجئے حضور! "لاہور" کے ایک مستقل سرپرست یعنی خریدار مسٹر بلکہ مولینا نسیم الرحمٰن صاحب ظفرآبادی کا کہنا ہے کہ

"چونکہ میں خود ایک طوائف ہوں اسی لئے مجھے جہاں تہاں ہر کہیں طوائف ہی طوائف بماجان نظر آتی ہے۔ اور گویا مجھے اس قسم کی فریب کاریوں کا نظر آنا محض ساون کے اندھے کی ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دیکھنے والی بات ہے"۔

ہوسکتا ہے اصل صورتِ حال یہی ہو ـــــ اگر بات فی الحقیقت یہیں پہنچ کر ختم ہوجاتی تو، لیکن وہ تو کچھ آگے چلتی ہے۔ یوں کہ

"وہ ہر جگہ موجود نظر آنے والی طوائف در اصل وہاں طوائف کی بجائے عورت بن کر بیٹھی ہوتی ہے"۔

اُس کے ماتھے پر اگر فی الواقعہ فاحشہ ہونے کا لیبل چسپاں ہوتا تو بات دوسری تھی۔ اُس کے ڈھب ہی کے لوگ اس سے میل جول رکھتے

اس سے گھُل مل سکتے۔ اور اگر اپنی کسی نفسیاتی یا جنسیاتی کمزوری کے باعث ہر حال میں اس سے تعلق رکھنے پر مجبور ہوتے تو اندھیرے سویرے میل ملاقات کے اوقات مقرر کرتے پھرتے ــــ لیکن وہ ظالم تو اپنے ماتھے پر کھدوائے ہوئے ہے لفظ عورت کا گویا،

- دوکان پر تو سائن بورڈ ہے ہیروں کا اور وہ بیچتی ہے ٹھیکریاں محض حزف ریزے۔
- نام لیتی ہے کافی کا لیکن پلاتی ہے سٹرانڈ سے بھرا ہوا دیسی ٹھرہ۔
- اپنے شجرے کے کوائف ملاتی ہے حوّا کی اُن بیٹیوں سے جن کے ایک اشارے سے روح الامین کی سانس رُک رُک گئی اور جن کی نگاہوں کی ادنیٰ سے ادنیٰ جنبشوں نے بھی گردش شام وسحر کے اوسان خطا کر دیئے لیکن پناہ مانگتا ہے اُس سے شیطان بھی۔ شعبدہ بازی ہیں۔ فریب کاری ہیں اور ریاسازی ہیں،

پھر یہی نہیں میرے نزدیک اُس سے بھی بدتر ہیں۔ اُس کے متمدّن اور مہذّب پاسبان۔ آپ لوگ۔

حُضور طائف کے نگراں تو جانے پہچانے لوگ ہوتے ہیں محض بزنس میں

قسم کے جن کے بشرول ہی سے ٹھیکیداریت ٹپک رہی ہو جو اس دھندے کو ایک ذریعہ معاش گردانتے ہیں اور

"جنہیں اب آپ کے ہوسناک ملمع پسند معاشرے نے اس بزنس کو ترک کر کے کوئی اور دھندا کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔"

لیکن خدا محفوظ رکھے آپ کے اِس بازار کے تعیش پسند مجاہدینِ ملت اور غازیانِ قوم سے

- جن کی کرڑک سے محراب و منبر بھی لرزتے ہیں اور جن کی ضمیر کے گھناؤنے پن سے قحبہ خانوں کے بھبکوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔
- وہ رضاکارانِ دلیر جن کے کندھوں کے ہلالی بیج دیکھ کر بڑے بڑوں کا طنطنہ سرنیوڑھا دے لیکن آخرِ شب نگارخانوں میں جن کی ذلت کو دیکھ کر یوں بھی محسوس ہو جیسے کم از کم اس ڈھانچ کی تعمیر میں خُدا کی بجائے اُس کا ندِ مقابل زیادہ دخیل تھا اور اس خمیر کو وجود دے کر اس کا اصل سانچہ بھی ریزہ ریزہ کر دیا گیا ہے۔
- جن کی کیفیوں اور ہوٹلوں میں دن رات عورت بکے بھی گھنٹے گھنٹے بعد اس کے سودے بھی ہوں اور وہ جب بات شروع کریں تو اُن کی زبان

ناپاک پر۔

"خدیجۃ الزہراؑ کی ردا کی قسم کے الفاظ کے سوا کچھ لہراتا بھی نظر نہ آئے"

- جو ایک طرف اسلامی۔ تربیتی اور ثقافتی اداروں کے سکرٹری جنرل سکرٹری اور صدر بھی ہوں اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایک پورے جنسیاتی کوچہ کا ٹھیکہ بھی اُنہی کے پاس ہو۔
- جو ماؤں اور بہنوں کی خود ہی قسمیں کھائیں اور خود ہی اُن کے سودے کریں۔
- جو خود ہی ناموس اور لُٹی ہوئی عصمت پر تقریریں جھاڑیں مقالے گھسیٹیں اور اداریئے ملوٗئیں اور خود ہی اُن کے بیوپار کا کمیشن کھائیں

"آپ کس دیس کی باتیں کرتے ہیں"؟

کیا واقعی آپ تجاہلِ عارفانہ سے کام نہیں لے رہے۔ کیا یہ سب کچھ آپ کے گرد و پیش میں نہیں ہوتا۔

- ہوتا ہے اور
- ہوتا رہے گا۔

کم از کم اُس وقت تک ــــ جب تک

"آپ اور آپ کے دوسرے ظاہر پسند ہمنوا بدقسمت عورت کو محض مرد کی تسکین اشتہا کا ایک ذریعہ تصور کرتے رہیں گے۔"

گو میرا ایمان یہ ہے کہ اگر تخلیق عورت کا مقصد محض مرد کے حلق میں شربتِ وصل کے چند قطرات نچوڑنا (چوانا) ہی ہوتا تو وہ جلیل قدیر اتنی سی بھڑک کو بجھانے کے لئے اتنا وسیع و عریض جھمیلا نہ کرتا اس آگ کو سرد کرنے کے لئے کوئی اور پانی پیدا کر دیتا

میں نے ساون کی اندھی ہونے کے باعث ایک عورت کو طوائف کہا تو آپ کو کوفت ہوئی اور آپ کا سکون ذہنی درہم و برہم ہو کر رہ گیا لیکن کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ اُسے عورت سے طوائف بنایا کس نے (میری مراد دونوں بازاروں کی طوائف سے ہے)

کیا وہ خود بخود ہی ایک دن مُنہ اُٹھا کر گھر سے مارکیٹ کی طرف چل دی تھی یا اُس کے آگے آگے رہنمائی کی قندیل اُٹھائے ہوئے آپ تشریف لائے تھے۔

اور کیا واقعی آج —— آپ کی نظر میں عورت کا وہی مقام ہے جو خدائے عزّ وجل نے روزِ اول مقرر کیا تھا، اُسے عطا کیا تھا۔

"بیچتے ہیں یا وا دبلند کہتی ہوں کہ ــــــ نہیں بلکہ حوّا - رابعہ - مریم - خدیجہ - زہرا اور خولہ کا تو ایک طرف، آپ کی نظر میں تو اُس کا درجہ اس جوتے کے برابر بھی نہیں ہے جو اس وقت آپ کے پاؤں میں پہنا ہوا ہے"۔

کیونکہ -

اتنی زیادہ تیز اور با غیرت حِسّ رکھنے کے باوجود جب کبھی

- خالی جیب پر آپ کو سینما دیکھنے کا شوق چرّاتا ہے -
- کم آمد پر زیادہ اخراجات اور الّلے تلّلوں کا دورہ پڑتا ہے
- بمشکل کھادی کی توفیق رکھتے ہوئے بوسکی پہننے کی ہوک اُٹھتی ہے -
- سائیکل کی استطاعت نہ رکھتے ہوئے ہُوک میں فراٹے بھرنے کی ترنگ آتی ہے -

تو آپ اس ترنگ کو پُورا کرنے ــــــ اِس اُمنگ کی لاج رکھنے ــــــ اس دورہ کا علاج کرنے ــــــ اور اس شوق کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بھی اپنا - وہ جُوتا - کوٹ - پتلون - مفلر - ٹوپی یا اچکن بیچنے کے متعلق غور نہیں فرماتے بلکہ

"عورت بیچتے ہیں ــــ طوائف بنا کر - کبھی محلّہ کی - کبھی پڑوس کی

اور کبھی اپنی"

باقی رہی یہ اندھیرے سویرے والی ـــــ کاروباری شرم تو ظاہر ہے
جو شرمائے گا ـــــــ وہ کمیشن کٹوائے گا۔
اور جو نہ شرمائے گا ـــــــ وہ ساری آمد خود پائے گا۔

یہ اور بات ہے کہ آپ کی اس روز روز کی خرید و فروخت سے
رفتہ رفتہ بعض عورتیں اتنی مشّاق ہو جاتی ہیں جیسی ـــــ ہم ـــــ کہ
"ایک دن آپ کو بھی بیچ نکلتی ہیں"

دور کہیں چوک میں سے کوئی افرنگی جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گزر
جائے۔ اُف توباہ۔ زمین پھٹ ہی تو جاتی ہے آسمان گر ہی تو پڑتا ہے۔
ایک طرف سارے کا سارا اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے تو دوسری
طرف ساری کی ساری شریعت اور تربیت اسلامی کی توہین ہو جاتی ہے۔
لیکن وہی مولانا الحیاء من الایمان کا ورد فرماتے فرماتے جب چوک
سے دس گز کے فاصلے پر ایک چار دیواری کی اوٹ میں آجاتے ہیں۔ تو
کیا کیا روا نہیں رکھتے؟

کیا نسیم الرحمٰن صاحب مظفر آبادی اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

بیویوں سے ۔مریدنیوں سے ۔ پرورش کے لئے لائی ہوئی یتیم بچیوں سے خبرگیری کے لئے پڑوس میں ٹھہراتی ہوئی بے بس بیواؤں سے لیکن اس کے باوجود آپ کو اعتراض ہے کہ گویا مجھے

خواہ مخواہ ہر جگہ طوائف ہی طوائف نظر آرہی ہے

میں اب اُس کے جواب میں کیا عرض کروں!

- اسلام کے عینِ فطرت نظام کو چھوڑ کر ایک بچے کو (جو بالکل معصوم و بے گناہ پیدا ہوا تھا) غیر فطری تربیت دی ـــــ آپ نے!
- لڑکپن میں اس کے لئے غلط ساتھیوں اور رفیقوں کا انتخاب کیا یا یا اچھے انتخاب سے بے پروائی برتی ـــــ آپ نے!
- اُس کے خام ذہن کے سامنے اپنی اشتہا پر ضبط نہ رکھتے ہوئے اُس کے دماغ میں قبل از وقت جنسیاتی ہیجان و تجسس پیدا کیا ـــــ آپ نے! اُس کے بالغ ہوجانے پر اُس کی خوشنودیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اُسے غلط۔ طبیعت کے اُلٹ۔ اور سراسر منحوس خاوند یا بیوی لاکر دی ـــــ آپ نے!
- تھوڑی آمد پر چنچل بیگم کے تقاضوں سے مجبور اور رہولے زمانہ

سے مسحور ہو کر حلال آمد میں رشوت کا حرام ملا کر بچوں کے خون میں گندے
جراثیم کو نشوونما دی ——— آپ نے

اور اب جب

آپ کی کرتوتوں اور کارہائے نمایاں سے نفسیاتی سفلہ پن اور جنسیاتی
کوڑھ کا وہ زہر معاشرہ کی نس نس میں سرایت کر گیا تو

آج ناک بھوں بھی آپ ہی سکیڑ رہے ہیں۔

کیا آپ کو یہ دیدہ دلیری کرتے ہوئے لاج نہیں آتی۔ کیسے بے دید
ہیں آپ!

(ز۔ ج۔ گ)

یہ لوگ دلّال ہیں - ایجنٹ ہیں اور

بس ۔ صبح سے لے کر شام تک دلّال ۔

ظاہر دلّال ۔ باطن دلّال لیکن حاشا وکلّا

اِس بازار کے کسی گاہک کا خاکہ کھینچنا اتنا

آسان نہیں جتنا اُن کا ہے ۔ کیونکہ فطرت

کی طرح اِن کے تو نام اور مقام بھی بدلتے

رہتے ہیں ۔ صبح اگر کسی کارگاہ میں ہیں تو

رات کو کسی نگارخانہ میں ۔ دوپہر کو کسی

تبلیغی ادارے کے قائد بنے ہوئے ہیں ۔

تو شام کو ناچنے والیوں کے لیڈر ابھی

آپ کو کسی اسلامی اسٹیج پہ کھڑے درود

شریف پڑھتے نظر آرہے تھے ——

دو گھنٹے کے بعد آپ کو سرحد پہ خام

مال کی ناجائز برآمد کرتے ہوئے ملیں

گے ۔

نواں خط

مدیرِ محترم! یہ آپ نے کیا اعلان کر دیا اپنے اخبار میں کہ اب حوصلہ افزا تبصروں۔ کڑوی کسیلی تنقیدوں کی بجائے ہر خط میں صرف ایک ہی چیز چلی آرہی ہے۔ فلاں چیز لکھیے۔ بیان کرتے وقت فلاں شق نہ بھول جائیے۔ اگر معاشرتی کمین گاہوں کو کریدنے بیٹھی ہی ہو تو ایک نظر ادھر بھی اور میں حیران ہُوں کہ ان تمام استفسارات۔ اور ان تمام مطالبوں سے عہدہ برآ کیوں کر ہو سکوں گی۔ پھر ستم یہ کہ ان لکھنے والوں کا تقاضا ہے کہ ہر ایک کے موضوع پر ایک ایک بھرپُور مکتوب لکھا جائے۔ گویا اب میں اپنا تمام دھندا چھوڑ دُوں اور صرف مدیرِ "لاہور" ہی کے نام خط لکھتی رہُوں۔ یہ کیونکہ ہو سکتا ہے۔

پیٹ کا یہ جہنّم اتنی گنجائشیں کب دے سکتا ہے مجھے!

کل صدر کراچی کے کسی م۔ ع۔ دین صدیقی صاحب کا بلبلاہٹوں سے معمور گرامی نامہ پہنچا ہے خیر سے اس مکتوب میں سب کچھ ہے۔

- زہر میں بجھے ہوئے طعنے۔

- ادبی موشگافیوں سے تیز کئے ہوئے نشتر
- میری کم علمی پہ قہقہے۔
- اور میرے چلن پہ آوازے اور مجھے خبر بھی نہیں کہ میرا کونسا نشتر نادانستگی ہی میں اُن کی کونسی رگ پہ جا پڑا ہے کہ

"گندے خون کی دھار اس تیزی سے اُبلنے لگی ہے"۔

تحریر فرماتے ہیں :۔

" عکاس جنسیات ! آپ کے دو ایک مکتوب میری نظروں سے گزرے حیران ہوں کہ آپ نے اس چھوٹی سی عمر میں اتنی وسیع معلومات کیوں کر حاصل کر لیں۔ اور اس دشت خارزار کی پیمائش میں آپ کو اپنا کون کون سا جوہر کھونا پڑا ہوگا۔ لیکن شکر خدا کا کہ آپ کی محنت اکارت نہیں گئی۔ آپ کو یہ لتا آگیا ہے۔ لکھنا آگیا ہے۔ شرافت کے منہ آنا اور نجابت کے گریباں گیر ہونا آگیا ہے۔ اُس بازار کے دلالوں اور اس بازار کے تینوں درجوں کے ایجنٹوں کا جو جو حلیہ آپ نے بیان کیا ہے۔ وہ آپ کے کس قدر قریبی مطالعے کی شہادت دیتا ہے۔ جیسے کوئی خوردبین سے کر جائزہ لیتا رہا ہو۔ لیکن ایک طائفہ پھر بھی رہ گیا۔ اور وہ ہے اس بازار

کے گاہکوں کا کیا اس پہ بھی آں محترمہ کا قلم اُٹھے گا یا نہیں۔ آپ کے

جواب کا انتظار کروں گا

م۔ ع۔ دین صدیقی۔ صدر کراچی

صدّیقی صاحب کے حُلیوں سے متعلقہ استفسار کی وجہ درصل یہ ہے

کہ میرا پانچواں مکتوب اُن کی نظر سے نہیں گزرا اور نہ اس میں ایک غریب پرور

عیاش کا حدود اربعہ کافی وضاحت کے ساتھ آگیا ہے ــــ یہ امر خوش کن ہے

کہ صدیقی صاحب آج کل کے اُن مہذب لوگوں میں سے نہیں ہیں۔

"جو بدررو کے پاس سے گزرتے وقت ناک پر رومال رکھ کر گزر جانے

ہی سے سمجھ لیتے ہیں کہ بدررو کا تعفن جاتا رہا"۔

بلکہ وہ توسیعِ معلومات کے لئے اصلاح احوال کے لئے۔ یا معاشرہ پر طعنہ زنی

یا پھر میری زبان درازیوں میں اضافہ کرنے کے لئے کم از کم اس گندا ور ریپ

کے بہتے ہوئے نالے کی گہرائی اور وسعت بھی ناپنا چاہتے ہیں۔

پچھلے دنوں آپ کے شہر لاہور سے ایک بزرگ تشریف لائے تھے۔

انہوں نے لاہور کی تازہ واردا توں میں سے سب سے چٹخارے لے لے

کر ایک دلال کی گرفتاری کی خبر سنائی۔ جو اونچے طبقے میں تازہ مال سپلائی

کرنے میں تھوک فروش ڈبلیر متصوّر ہوتی تھی۔ بڑے اخباروں کے اشتہاری کالموں کی طرح جس کے ادارہ عالیہ سے منسوب و متعلق دوشیزاؤں کی بکنگ بھی ایک ہفتہ پہلے ہو جاتی تھی، اور نقل و حمل کے لئے جس نے اپنے خرچ پر تین چھوڑ چار کاریں رکھ چھوڑی تھیں۔ خدا جانے کسی من چلے پولیس افسر کو معطّلی اور برخاستگی کے منحوس تصوّر نے کس بری طرح کاٹا کہ وہ اس کے گریبان گیر ہو گیا اور گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ بس پھر کیا تھا! اس پکڑی جانے والی۔ امّاں۔ بی بی۔ بہن۔ بھائی۔ خالہ اور بُوا کی خبر آگ کی طرح لاہور کے گلی کوچوں میں پھر گئی اور پھر آن کی آن میں کاروں ٹیکسیوں اور تانگوں کا تھانے کے سامنے وہ تانتا بندھا کہ الامان! ایک غیر معروف چوک اور ایک اجاڑ بیابان موڑ پر بیک وقت دو دو سنتری ٹریفک کو باقاعدہ کرنے کے لئے کھڑے کرنا پڑے۔

ان کاروں میں کون لوگ تھے! —— سنیئے! ——

- پاکستان کے نئے الاٹی تجار حضرات
- جعلی اور لائسنسوں ہی کی بلیک کرنے والے امپورٹر ایکسپورٹر۔
- سینماؤں کے نگہدار۔ لینڈ لارڈ۔ بھوک کے شوقین۔ اونچے انگریزی خواں ایجنٹ۔ جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کسی نہ کسی امیر کبیر۔ وزیر

اور کونسلر یا بڑے حاکم کی چٹھی تھی ـــــ کوئی کسی بڑے وزیر کی رشتہ داری کے زعم میں چلا آیا تھا اور کوئی کسی اعلیٰ پولیس افسر سے مراسم دوستانہ ہونیکے دعوے پر، اور کوئی خود ہی کافی بڑا آدمی تھا۔ کوئی احسان شناسی کے طور پر، اور کوئی محض اس نیک اصول کے تحت، کہ "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" انسان پر مصیبت روز روز نہیں آتی، دراصل انسان ہی انسان کا دارو ہے۔

طرّے فیلٹیں۔ جناح ٹوپیاں چمکتی ہوئی چندیائیں اور کالی کھجوروں کے خوشے جیسے گنجان بال، پتلونیں، چُست پاجامے۔ کار ڈرائی کی پتلونیں اور ملتانی لنگیاں۔ القصہ دنیا کی کونسی شے تھی جو اس شریف خاتون کی رہین احسان نہ تھی اور جو یہ خبر منحوس سنتے ہی لپک نہ پڑی تھی۔ اے کاش اس وقت کیمرہ اس پاس ہی ہوتی تو کرائے پر کیمرہ سے کر بھی اس منظر حسین کو اس میں جکڑ لیتی۔ اب اس بازار کے خریداروں کا اتنا شاندار اجلاس عام پھر نہ جانے کب ہو۔ اور ایک ہی وقت میں ان تمام کے حلیے پڑھنے اور بشرے دکھانے کا موقع پھر جانے کب ملے۔

ویسے صدیقی صاحب اگر آپ برا نہ مان جائیں۔ تو عرض کردوں کہ فی الواقعہ آپ بھی تو چہرے مہرے کے اپنی تحریر کے سے ہی ہیں نہ؟ اسی طرح کے

جاذب، نستعلیق اور ستھرے۔ پھر آپ کی تحریر اس قدر جامع معلومات کی حامل ہی آپ کو تو یہاں تک یہاں تک بھی علم ہے کہ اس بازار میں کتنے عرصے میں ایک انسان کی کتنی روحانی بالیدگیاں نذر ہو جاتی ہیں ہیں کس طرح مان لوں کہ:-

- راہ چلتے ہر پاس سے گزرنے والے برقعے کے لہرانے پر آپ کی نظر بے ساختہ برقعے والی کی صراحی دار ملیوریں گردن پر اٹھ نہ جاتی ہوگی۔ اور بہزار احتیاط وضبط کے باوجود آپ کھانس نہ پڑتے ہوں گے۔ آپ کے منہ سے سلام علیک، جیو یا ہمارے لئے جیو، کے ثنائیہ الفاظ نہ نکل جاتے ہوں گے
- سینما میں ہاف شو ہوتے ہی آپ کی نظریں پلٹ کر عورتوں کی پچھلی قطاروں پر نہ جم جاتی ہوں گی۔
- اور ہال میں داخل ہوتے وقت آپ نے کسی عورتوں کی ٹولی کے پیچھے بیٹھنے کی کوشش نہ کی ہو گی۔
- اور یہ تو بارہا ہوا ہو گا کہ بس پر چڑھتے وقت آپ نے نہایت بے نیازی کے ساتھ کسی خاتون مسافر سے اپنا شانہ رگڑ دیا ہو

- کسی دوشیزہ سائیکل سوار کو دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیا ہوگا۔ یا اُس کو ساتھ ملانے کے لئے یونہی اُتر کر نہ اُتری ہوئی زنجیر چڑھانی شروع کر دی ہوگی۔
- اور یہ تو یقیناً اکثر ہوا ہوگا کہ آپ نے کسی دوست عزیز یا واقفکار کے ہاں فون کیا اور وہاں سے نسوانی آواز سُنائی دی تو آپ نے بات کو یونہی خواہ مخواہ طول دینے کی کوشش کی۔
- کیا آپ کے دفتر کے راستہ میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں آتا۔ تو آپ کتنا زیادہ راستہ طے کر کے کالج کے راستہ سے دفتر میں پہنچتے ہیں؟

میں یہ کس طرح مان لوں کہ آپ نے باغوں یا پارکوں میں گھنٹوں لڑکیوں کا تعاقب نہیں کیا ہوگا۔ اگر ان تمام ابتدائی باتوں کا پچاس فی صدی جواب بھی "ہاں" میں ہے اور آپ مانیں یا نہ مانیں یقیناً "ہاں" ہی میں ہوگی۔

"تو پھر حضور آپ اپنا ہی روئے مبارک آئینہ سے کیوں ملاحظہ نہیں فرما لیتے۔"

دوسرے گاہکوں کو تو کوئی سُرخاب کا پر تو نہیں لگا ہوتا۔ بہر حال

گرفت کا دور اب ہے ہی نہیں۔ بس گناہ وہ ہے جو موقع پر پکڑا جائے۔ آپ بے دھڑک اپنے مشاغل کو جاری رکھیئے ع

یہ ہے تو ہین جوانی کہ خدا یاد رہے

میں نے اس سے قبل جن حلیوں کو وضاحت کے ساتھ لکھا تھا، وہ خاص قسم کے چہرے تھے مخصوص ہیئت کے مخصوص سانچوں میں ڈھلے ہوئے، وہ لوگ جن کی زبان چال ڈھال اور یاران بزم ایک خاص وضع قطع کے ہیں لیکن آپ لوگوں کے تو بہروپ ایسے ایسے ہیں اور دن میں اتنی بار کینچلی بدلتے ہیں۔ کہ مجھ پابند مسکن کا تجسس ان وسعتوں کو ناپ ہی نہیں سکتا۔ اس بات سے تو آپ کو بھی اتفاق ہو گا کہ میں عالم الغیب تو ہوں نہیں۔ یہ محض قیافہ بازی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ دیکھ دیکھ کر نئے چہروں کو پہچان لینے کی کچھ مشق سی ہو گئی ہے۔ ہاں ایک اور بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ دلال ہیں۔ ایجنٹ ہیں اور بس۔ صبح سے لے کر شام تک دلال ظاہر دلال۔ باطن دلال۔ لیکن حاشا و کلا اس بازار کے کسی گاہک کا خاکہ کھینچنا اتنا آسان نہیں جتنا ان کا۔ کیونکہ فطرت کی طرح ان کے تو مقام اور نام بھی بدلتے رہتے ہیں۔

"صبح اگر کسی کارگاہ میں ہیں تو رات کو کسی نگار خانہ میں۔ دوپہر کو کسی تبلیغی ادارے کے قائد بنے ہوتے ہیں تو شام کو ناچنے والیوں کے لیڈر بھی آپ کو کسی اسلامی اسٹیج پہ کھڑے درود شریف پڑھتے نظر آ رہے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد آپ سرحد پہ خام مال کی ناجائز برآمد کرتے ہوئے ملیں گے۔"

اور ان سب پہروپیوں پہ بھی وہ وقت سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جب یہ گاہک خرید و فروخت میں مشاق ہونے کے بعد اپنی دلالی بھی خود ہی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور دلالی کی فیس بکنے والی کی قیمت خرید میں سے کم کر لی جاتی ہے۔ خدا ایسے ایسے تاجرانِ واردات و صادرات سے بچائے۔ ان سے بعض دفعہ مزدوری ملنا بھی مشکل ہو جاتا ہے تحفہ یا دکھشنا تو ایک طرف رہے باقی رہا آپ کا یہ طعن۔ کہ چلتے مجھے شرافت کے گریبان گیر ہونا تو آ گیا۔" تو یہاں میں صرف یہ عرض کروں گی کہ حضور آپ نے یہ اندازہ فرما کر مجھ پہ ظلم کیا ہے آپ کا مطالعہ نامکمل ہے آپ نے میری ساری محنت ضائع کر دی۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ نے صرف ایک دو خط ہی سیاق و سباق سے بے نیاز ہو کر پڑھے ہیں۔ اور آپ کی مثال بالکل ویسی ہی ہے کہ ایک آدمی

اندھا دھند رُباب کے تاروں پر ہاتھ دے مارے اور جب اُن تاروں سے
نغمہ کی بجائے محض ایک بد ذائقہ اور ڈراؤنی سی چیخ پھوٹے رُباب والے کو
کوسنا شروع کردے۔ حالانکہ اگر وہ باقاعدہ زخمہ پکڑتا اور اس زخمہ سے تاروں
کو اُسی ترتیب سے چھیڑتا جس ترتیب سے چھیڑنے پر نغمہ پیدا ہوا کرتا ہے۔
تو یوں جز بز ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔ واقعی اگر آپ میرے پہلے خط سے
لے کر اب تک ترتیب کے ساتھ سب پر نظر دوڑاتے تو کم از کم آپ مجھ پر یہ طعن کرنے
کی جسارت نہ کرتے، صدیقی صاحب!

- میں تو نشاندہی کر رہی ہوں کہ دراصل نجاست کہاں ہے اور شرافت کا
لبادہ اوڑھ کر نجاست کہاں کہاں براجمان ہے
- یہ کہ "آپ تو سائن بورڈوں والی طوائف کو رو رہے ہیں حضور؟
طوائف تو اُن مخصوص اڈوں اور کوٹھوں سے نکل کر آپ کے محلول صحنوں
اور برآمدوں میں آگئی۔ ع

زباں بگڑی سو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

- آپ اُن چند مشٹنڈوں کو رو رہے تھے جن لوگوں نے تن آسانی
کو عصمت اور غیرت پر ترجیح دے دی لیکن دہائی خدا کی اس بستی

دولت اور الاٹ شدہ امارت اور تماش بینی نے تو ہر شخص کو اپنے ہی کُنبے کا ایجنٹ بنا کر رکھ دیا۔ صدیقی صاحب یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر عموماً قومیں ترقیٔ معکوس کی پٹخنیاں کھا جاتی ہیں،

رع۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

جو شخص اپنے کُنبے کی عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ ملک کی ناموس کے تحفظ کی کیا خاک ضمانت دے گا۔ جو نام نہاد مرد مصیبت پڑنے پر اپنے ذہن جسم اور رُوح کی وقتی تفریح یا سکون کے لئے اپنی ماں بہن یا ہمسایہ خاتون کی عصمت فروخت کر دیتا ہے۔

"وہ کل کلاں کو ملک کے وقار کا سودا کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لے گا۔ یہ آپ کا وہم ہے محض"

ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میرا اندازِ بیان ضرور تلخ ہے، میرا طرزِ تخاطب ضرور زہریلا ہے۔ تو حضور میں ہوں بھی تو ایک طوائف مجھ سے آپ اُس آسمانی زبان کی توقع ہی کیوں رکھتے ہیں۔ ——— بلکہ اگر آپ زیادہ مُنہ نہ لیسوریں تو عرض کروں کہ اس مارکیٹ کی تو زبان ہی یہی ہے۔ اس بازار میں تو زجر و توبیخ کی اسی قسم کی اصطلاحیں اور رنبہ نشیں جالو ہیں۔ ہیں

اگر کوئی اور انداز اختیار کرتی تو شاید آپ اتنی کسک محسوس ہی نہ کر پاتے ——— آپ نے شدت کے ساتھ کسک محسوس کی۔ اور آپ فرطِ درد و کرب سے بلبلا اُٹھے گویا میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔ خدا حافظ!

(ز۔ ج۔ گ)

اب آپ ہی دیکھئے نہ ۔
میں پڑھی لکھی ہوں ۔ سرد و
گرم زمانہ سے خوب آشنا بھی
ہوں ۔ میرے دل میں خدا کا ڈر بھی
موجود ہے ۔ لیکن —— وہ لوگ
جو صرف میرے جسم کا لوچ دیکھ کر
صرف میرے ہی لئے پیغام شادی
لاتے ہیں میں اُنہیں کیا کروں ۔
میں اُن کے لئے ان رینگتی ہوئی
لاشوں اور اس ہاتھ کٹے یتیم
کو کہاں دفن کروں —— نہیں
تو موت بھی نہیں آتی ۔

دسواں خط

خدا جانے آپ کی ان دنوں کیسے گزر رہی ہے۔ اور آپ کے قلم و
زبان پر کس کس رُخ سے پہرے بٹھانے کی سازشیں زیرِ غور ہوں گی۔ میرے
ہاں تو سلسلہ جُنبانی شروع ہے میرے خیال میں اگر لاہور کی مٹی ذرا بھی زرخیز
ہے تو اس ہلکے سے نم سے بھی شور و غوغا کا ایک طوفان بدتمیزی بپا ہو گیا ہوگا
آپ کے خلاف اور "زبان دراز ہے" "باغی ہے" - "وطن دشمن" ہے.
کے آوازے چاروں طرف بلند ہو رہے ہوں گے لیکن اگر آپ کی اتنی
جھنجوڑ کے باوجود کسی نے پلک نہیں جھپکی تو سمجھئے مرض لاعلاج ہو گیا۔
میرے اور آپ کے بلکہ ہر شریف انسان کے بس میں تو صرف طعنے - کوسنے
کچوکے اور ادبی ملاحیاں ہی ہیں کہ کوئی ہڑبڑا اُٹھے لیکن جو انہیں بھی
رجعت پسند تہذیب کی خوش فعلیاں جان کر ٹال جائے اس کا تو پھر
اللہ ہی حافظ ہے - اس وقت یا تو رحمت خداوندی کی وسعتیں ڈھانپ
سکتی ہیں یا پھر قہر خداوندی کی پہنائیاں۔

لیکن صد شکر کہ یہاں حالت قدرے مختلف ہے اور دو چار مکتوب پڑھنے کے بعد ہی سے ماحول میں کافی ہڑبڑاہٹ اور کھولن موجود ہے بلکہ اب تو کچھ دنوں سے ایک خاص قسم کا تجسس کسی سرکاری شے پہ میری حرکات کی ناکہ بندی کئے ہوئے ہے۔ اور اسے میری معمولی سے معمولی انسانی لغزش بھی قلم بند کر لینے کا حکم ہے۔ مجھے اس محاصرہ کے ہاتھوں پچھلے دنوں بظاہر تو اذیت ہی پہنچی لیکن روحانی طور پر ایک لازوال مسرت بھی ہوتی۔ مسرت اس امید پہ کہ

"جو معاشرہ تاؤ کھا کر آج میری غلط گوشمالی پر آمادہ ہوا ہے میرا خدا اُسے کبھی اپنی صحیح اصلاح کی توفیق بھی دے گا"!

نقص در اصل یہ واقعہ ہوا ہے کہ میری زبان کی طرح آپ کو بھی اپنے قلم پہ قابو معلوم نہیں ہوتا۔ بس جو انٹ شنٹ زبان خامہ پر آیا گھسیٹ دیا۔ حالانکہ "بولنے سے پہلے تولنا" بزرگوں اور داناؤں کا پرانا آزمودہ اور کارآمد مقولہ ہے معلوم ہوتا ہے میری زبان اور آپ کے قلم کی اسی بے لگامی کا کوئی مجروح ہی ان دنوں میرے سکون کے درپے ہے۔ حالانکہ میں نے واقعات کو بیان کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا التزام کیا ہے۔ کہ چند

باتیں لکھا جاؤں اور چند بیجا نیں مسخ کر دوں۔ دو وجوہ کی بنا پر۔

اوّل:۔ یہ کہ میرا دل کسی کو ننگا کرنا نہیں چاہتا اور نہ میرا اس تقریر و تحریر سے یہ مقصد ہی ہے۔

دوم:۔ اس لئے کہ ابھی میرے سماج کا ظرف اتنا وسیع نہیں ہوا۔ ابھی قانون میں بھی بڑی لچک اور انصاف کی راہ میں سینکڑوں رکاوٹیں ہیں ابھی ہم اتنے دلیر، منصف مزاج اور اپنے امور میں واضح نہیں ہونے پائے کہ جس چیز کو دل سچا مان جائے۔ قرائن اس کے سچا ہونے کی تصدیق کریں۔ اسے جھوٹی شہادتوں کا سہارا لئے بغیر ہی سچا قرار بھی دے سکیں۔

اس کے لئے ابھی صداقت۔ حوصلہ اور جرأت مندی کو بیسیوں بھٹیوں میں سے گزرنا ہوگا۔

ہاں تو میں عرض کر رہی تھی کچھ اپنے معاشرتی محاصرہ کے متعلق یہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں کہ میرا ابھی بہرحال ایک بھلائی چارہ ہے۔ ہم بھی رسوم و تقاریب اور تہواروں پہ اور شادی و غم کے موقعوں پر ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ہیں۔ مبارکیں۔ دعائیں اور سلامیاں لیتے اور دیتے ہیں۔ چنانچہ

چھوٹے بھائی کے انتقال کے بعد کافی لوگ جان پہچان والے آتے اور جاتے رہے۔ واقف۔ آشنا۔ کم آشنا۔ تعلق والے۔ بالواسطہ تعلق والے اب ایک انسان۔ ایک مغموم عورت سب آنے والوں کے دل کیونکر پڑھ سکتی ہے۔ کہ کوئی کس نیّت سے آیا ہے اور اُس کے آنے کا مقصد کیا گل کھلانا ہے —— انہی آنے والوں میں ایک صبح عیدن کسبی اور اُس کی دونوچیاں بھی آگئیں۔ اور ابھی عیدن نے سُوکھی آنکھوں پر گیلے دوپٹے کا کونہ پھیر پھیر کر ناک سُمکا سُمکا کر تعزیت شروع کی ہی تھی کہ میرے کوٹھے کے نیچے دودھ والے کا لڑکا ہانپتا کانپتا ہوا اوپر آیا اور مجھے ایک طرف لے جا کر بتانے لگا کہ

"پولیس میرے مکان کو چاروں طرف سے گھیر رہی ہے میں جلد کوئی بندوبست کر لوں۔"

پولیس میرے مکان کی طرف ؟!

میں کیا بندوبست کر لوں آخر! آ رہا ہوگا کوئی باوردی تعزیت کے لئے۔ بہرحال بچے کا پیغام ایک ثانیے کے لیے بھی مجھے فکرمند نہ کر سکا یہی وجہ تھی کہ جب میں اُس سے ہٹ کر عیدن مخبرہ کے پاس آئی تو میرا چہرہ

کسی نئے تردد کا غماز نہ تھا لیکن اس نے کہا تھا سچ ! ـــــ کہ دس منٹ
کے اندر اندر ہی انسپکٹر صاحب پستول سنبھالے "ہینڈز اپ" کہہ کر دہشت زدہ
کرنے کی خاطر پہنچ گئے۔ آتے ہی سب سے پہلے تو انہوں نے
"اپنا مقام و مرتبہ بھول کر خاص پولیس کی تکنیک میں مجھ نابکار کو اپنی
فن کارانہ اصطلاحوں سے نوازا۔"
جنہیں سن کر میرے دل نے دمبرے پاس آوائل میں آنے والے ایک تھانیدار
پاس تھانیدار، کی اس بات کی ایک دفعہ پھر توثیق کی کہ
"تھانیداروں کی تربیت کے کورس میں مغلظات کی تخلیق کا کوئی
نصاب نہیں ہوتا۔"
اور پھر جب وہ اس سرکاری کتاب سے یہ دو چار سو سٹینڈنگ آرڈر
مجھے ازبر سنا چکے تو فردِ جرم پڑھ کر سنانے کی نوبت آئی۔ الزام لگا کہ
"کہ میں نوجیوں کا بیوپار کرتی ہوں۔ اور یہ وہ اسی گتھے میں سے
ہیں ـــــ"

- نہیں، اور نوجیوں کا بیوپار !
- گویا اس فعلِ بد کی وسعتوں کا کاروبار ؟

• پھر یہ نوچیاں جنہیں عیدن اپنے ساتھ لائی ہے؟

ابھی ابتدائی حیص بیص ابھی جاری تھی کہ ہمارے کونسلر ملک صاحب آگئے اور انہوں نے آکر میری شرافت کی گواہی دے کر انسپکٹر صاحب کو یقین دلایا کہ وہ نوچیاں در اصل عیدن کی ہیں۔ اس پر محلے والوں کا تصدیقی شور و غوغا لیکن وہی

کھسیانی بلی کھمبہ نوچے

والی بات اب انسپکٹر صاحب بضد تھے کہ یہ نہ سہی اور ضرور ہیں ہیں سارے مکان کی تلاشی لوں گا۔ ادھر میری ہر ممکن خواہش تھی کہ وہ اندر نہ جانے پائیں میرا کاروباری بھرم آشکار ہو جائے گا۔ اتنی پبلک کے سامنے گھر کی بات باہر آجائے گی۔ لیکن جب ان پر بھائی کی وفات۔ رشتہ داروں کی موجودگی اور میری لجاجتوں کا اثر اچھا ہونے کی بجائے الٹا پڑنا شروع ہوا تو میں نے بے بس ہو کر صحن میں کھلنے والے دروازے کے کواڑ وا کر دیئے۔

"اف رنڈی کے اصلی چہرے اور جسم کی طرح اندر سے اس کا گھر بھی کتنا گندہ اور گھناؤنا ہوتا ہے!

میری ماں اندھی ہیں۔۔ ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ انہیں

دمہ کا عارضہ ہے۔ لہٰذا وہ سارا سارا دن پڑی بستر پہ کھوں کھوں"
کرتی رہتی ہیں۔
میرے ابّا ایک مفلوج و مسلول آدمی ہیں۔ بس ایک چُڑ مُڑ سا پنجر سمجھئے
انہیں جو ایک کھٹیا پر ڈھیر رہتا ہے۔
اس کے علاوہ میرے ہاں میرے وطن کے جولاہوں کا ایک بچہ رہتا
ہے اس کے والدین ۴۷ء کے فسادات کی نذر ہو گئے تھے، اور اس کے
دونوں ہاتھ کسی گورو کے پیارے کی کرپان چاٹ گئی تھی۔ وہ اسی بھاگم
بھاگ میں گرتا پڑتا ہمارے ہاں پہنچ گیا تھا اور اب یہیں ہے۔
ایک بھابی ہے۔ بیوہ بھابی جو سارا دن نوکرانیوں بلکہ مہترانیوں کی
طرح کام کرتی ہے۔ کپڑے دھوتی ہے۔ فرش جھاڑتی ہے۔ جھاڑو
دیتی ہے برتن مانجھتی ہے اور اُسے مہینوں سر میں پانی ڈال لینے کی فرصت
تک نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک طوطا ہے اور ایک بلی۔
میرے دو نوں نوکر پارٹ ٹائم ہیں اور وہ میری دکان کے
وقت ہی پہ آتے ہیں۔
اب آپ ہی غور فرمائیے ایسے اجاڑ و ویران گھر میں بھلا کیا

میسّر آسکتا تھا،

چند میلی کچیلی رضائیاں - چار پانچ نیم شکستہ چارپائیاں - دس بارہ تانبے اور اور تانبے چینی کے برتن - ایک گلا سڑا حقّہ - فرش پر گند - دیواروں پر گرد اور دھوئیں کا مٹیالا پن - گھڑوں پہ کائی - چھت پہ دھوئیں کی گہری تہیں کرسیوں کے بازوؤں پر میل بستروں کے چیکٹ تکیئے - اور ٹوٹا پھوٹا سا فرنیچر جس کی ہر شے پر فرنیچر کا ہر حرف "الزام" نظر آئے،

انسپکٹر صاحب نے اندر نگاہ ڈالی تو ملک صاحب کی طرف دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے - ناک پر رومال رکھ کر بظاہر تلاشی کی غرض سے اندر تو گئے لیکن جلد ہی نمناک آنکھیں لئے باہر نکل آئے - اور چھوٹتے ہی مجھ سے کہنے لگے، "تمہارا اور یہ حال؟"

میں نے عرض کیا۔ "ہاں حضور! امیرا اور یہ حال! لیکن دکھ تو یہ ہے کہ دنیا مجھے اس حال میں بھی جینے نہیں دیتی -"

انہوں نے ذرا اور رحم دلی کا مظاہرہ کیا تو مجھے ذرا کھُل کر برسنے کی توفیق مل گئی - ———

"اب آپ ہی دیکھئے نہ؟ میں پڑھی لکھی ہوں - سرد و گرم زمانہ سے خود با

آشنا بھی ہوں میرے دل میں خدا کا ڈر بھی موجود ہے لیکن۔

"وہ لوگ جو صرف میرے جسم کا لوچ دیکھ کر صرف میرے لئے ہی پیغام

شادی لاتے ہیں میں انہیں کیا کروں میں اُن کے لئے ان رینگتی ہوئی لاشوں

اور اس ہاتھ کٹے یتیم کو کہاں دفن کر دوں ـــــ"

انہیں تو موت بھی نہیں آتی ـــ لے دے کے سودا سلف لانے کے قابل

ایک بھائی ہوا تھا وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ نیت تھی کہ اُسے جی بھر کر

پڑھاؤں گی

شاید اُس کا علم ہمیں اس ذلت سے نجات دلا دے

لیکن وہ بھی کوئی آٹھ دن ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا ـــــ افسوس کہ قانون کے

بھی کان ہی ہیں آنکھیں نہیں ہیں۔

ستم بالائے ستم کہ وہ سماج جو اپنے آپ کو نیک کہتا۔ نیک کہلاتا۔ اور

نیک کہلانا پسند کرتا ہے وہ مجھ۔ ایک رنڈی کو نیک بننے کے لئے مراعات

نہیں دیتا۔

یہ انسپکٹر صاحب دراصل اُن آغا صاحب کی شرارت پر آئے تھے۔ جن

کا حلیہ اور مشاغل کسی پچھلے خط میں ذرا تفصیل کے ساتھ لکھ چکی ہوں۔ ان دنوں

وہ خود اپنا ایک ہوٹل کھولنا چاہتے ہیں۔ تاکہ آمد سے کمیشن کی کٹوتی بچائی جاسکے۔

یہی افسر پرسوں پھر آگئے۔ اُن کے ہاتھ میں لاہور کے پانچوں خطوں والے شمارے تھے۔ دیر تک "اِسی بازار" کے وجود و قیام کی وجوہ پر بحث کرتے رہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میرے دوست بن جائیں۔

"پولیس والوں کی دوستی عموماً مخبری کا الزام ہی دلایا کرتی ہے۔"

اِدھر میں ڈرتی ہوں۔ شاید یہ میری اُس دن کی حالت زار کو محض میک اپ ہی سمجھتے ہوں اور اب گھُل مل کر حالات کا جائزہ لینے کے خواہشمند ہوں۔ زہے قسمت۔ آئین میں نے کونسا ملمع کر رکھا ہے ——— یہی وجہ ہے کہ میں قدرے ریزرو ہوں۔ چنانچہ اُن کے موضوع بحث کے متعلق بھی میں نے اشارۃً صرف یہی کہنا مناسب سمجھا۔

"حضور یہ شرم، حیا، غیرت، خودداری اور شرافت تو نہایت ہی لطیف پردے ہیں۔ جن پہ اگر یونہی برسبیل تذکرہ بھی کوئی تیز ناخن ہی پھر جائے۔ تو اُن میں ہمیشہ کے لئے ایک اِلمنٹ شگاف سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جو پھر عمر بھر بڑھتا ہی رہتا ہے۔

رفو ہو جانے کی مثالیں ڈراموں اور افسانوں کے سوا کہیں سُنتے ہیں

نہیں آئیں۔

مثال کے طور پر

- تقسیم کے آرے سے چرے ہوئے مہاجرین کو نظم ونسق سے عدم واقفیت کے باعث تارکینِ وطن کے مقفل مکانوں کو تالے توڑ کر اندر گھس جانے کی تلقین کر کے ایک دفعہ تو ہم نے ہر شریف آدمی کو یہ فعلِ بد سکھا دیا اور اب ۔ ع

اب مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں

کتنے ہی بُرے کام ہیں ۔جن کا نتیجہ نیکی اور محض نیکی ثابت کیا جاسکتا ہے ۔

- ایک دفعہ ایک صاحبِ غرض شریف آدمی ایک بد باطن اور بد اطوار حاکم امیر یا کسی صاحبِ اقتدار سے مطلب براری کے لئے جنسی رشوت از خود پیش کر دیتا ہے اور اسے معاشرے کی مجبوری کے نام سے تعبیر کرتا ہے
- دوسری دفعہ اپنے کسی دوست وہمسایہ یا رشتہ دار کو اسی چنگل میں پھنسا دیکھ کر اسی بد باطن صاحبِ اقتدار کی اشتہا کو ٹھنڈا کرنے کے اسی طریق کا مشورہ دیتا ہے۔
- اور تیسری پھر چوتھی دفعہ معاشرہ کی یہی مجبوری۔ عادت بزنس اور ایذادی

تعلقات کا زینہ بن کر رہ جاتی ہے،

ایک دو دفعہ آپ اپنی جیب میں ساری فیملی کو سینما دکھانے کی توفیق نہ رکھتے ہوئے ہمسایہ کے لائے ہوئے پاس پہ نظر بازی فرما آتے ہیں۔ دوسری دفعہ آپ مصروفیت کے باعث جا نہیں سکتے تو آپ کے جوان و نوجوان بچے اُس کے ساتھ آپ کی اجازت سے جا کر دیکھ آتے ہیں اور تیسری دفعہ یہ ذہنی عیاشی کی چاٹ خود بخود ہی وقت متعین کر لیتی ہے۔

آپ اس مجبوریوں بھرے دَور میں وجوہ کرید رہے ہیں جس میں ننگے مُنہ پھرنا خدا کو بدتمیزی اور بے باکی کے ساتھ خطاب کرنا، پارکوں میں آوارہ پھرنا مستقبل کی مشق کے لئے ایکٹو پکچریں دیکھنا۔ رومانس لڑانا، حتیٰ کہ سرد و گرم زمانہ سے آشنا ہونے کے لئے محبت کا فریب بھی ضرور کھانا ایک بہت بڑی مجبوری ہے جس کے بغیر زندگی مکمل ہوتی ہی نہیں، بلکہ اب تو شادیوں پہ معاہدے بھی کچھ اس قسم کے ترقی یافتہ ہونے لگے ہیں۔ جن کی رُو سے دونوں کا ایک دوسرے کے امُور داخلہ میں دخیل ہونا بھی بس کم سے کم رہ جاتا ہے،

پھر ــــــ اس دَور میں رُوحانیت۔ اخلاق۔ نیکی۔ شرافت اور غیرت۔ ایسی قدروں کو پُرانے چودہ سو سال کی گھسی پٹی قیود بتانے والوں کی کمی

بھی نہیں۔ یہاں تو ایسے ایسے چرب زبان پرچارک موجود ہیں جن کا بس چلے

تو ——— آج ہی قوم کی ناموس کو نیلام کرنے کا آرڈیننس پاس کرا دیں۔ جن کی تحریروں

میں فحاشی بہ عروج وکمال اس رنگ میں موجود ہے۔ کہ بعض معصوم جسم انہیں پڑھ

پڑھ کر ہی ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ کسی ایسے ملک کے مبلغ ہیں۔ جو

آپ کے ذہن سے یہ تمام نیک پہرے اٹھا کر اس حیوانی اشتہا کو مسلط کر دینا

چاہتے ہیں جس کے بعد شاید ——— انسان انسان نہیں رہتا ——— اب

آپ تصور تو کریں ذرا اس معاشرے کا جس میں آپ کی بہو بیٹی ماں اور بہن پہ

مجھے بھی اتنا ہی حق ملکیت حاصل ہوگا جتنا آپ کو میری پہ۔ کیا اس میں ہمارے

چکلوں کو پرانی تہذیب والے متمدن سمجھنے لگیں گے۔

آپ نے بھائی کی تعزیت فرمائی۔ آپ کا احسان! تجہیز وتکفین میں کوئی خاص

وقت پیش نہیں آئی! ملاجی کو پیشگی جنازہ کی فیس بھجوا دی تھی۔ وہ وقت سے پہلے

ہی آ گئے تھے کفن وغیرہ سب خود انہوں نے تیار کیا تھا۔ اب روزانہ دونوں

وقت کھانا ان کے گھر پہنچ جاتا ہے کھانا اور دو چونیاں پہلے دو دن تک

تو وہ آنکھ بچا کر خود بھی تشریف لے آتے تھے، بلکہ ایک دن تو وہ ہماری

دریا دلی سے اس قدر متاثر ہوئے۔

کو دیر تک بعض ایسے ایسے جھوٹے واقعات سُناتے رہے۔ جن میں ہمارے
پیشے کو 'بیشہ' ہونے کی وجہ سے جائز۔ حلال اور طیب قرار دیا گیا تھا۔"
میں نے کہلا بھیجا تھا کہ وہ بھائی کے متعلق استخارہ کریں کہ وہ "جنت میں گیا
ہے یا نہیں" اچھی خبر آئے گی تو آپ کا مُنہ چونّیوں سے بھر دوں گی۔
"اور مجھے یقین ہے یہی چونیاں انہیں اس معصوم کو جنت سے نکال کو کسی
دوسری جگہ بھیجوانے کی خبر گھڑنے سے ہرچند باز رکھیں گی"
ابھی تک عزیزوں، محلّہ والوں اور جان پہچان والوں کے آنے جانے
کا سلسلہ شروع ہے۔ اور ویسے بھی میرا ذہن اصل مقام سے متزلزل ہے
وہ ـــــ ہماری مستقبل کی اُمید تھی وہ ہمارے لئے روشنی کی ایک کرن تھی
وہ مفلوج۔ مسلول اور مدقوق خاندان کا واحد تیماردار تھا۔ ننّھا تیماردار۔ میرا
لاڈلا گھنگھریالے بالوں والا راجہ بھائی!

(ز۔ ج۔ گ)

بڑے آدمیوں کے دل بھی بڑے ہی
وسیع ہوتے ہیں۔ اُن کے ظرف کی گہرائیاں
کوئی کس طرح ناپ سکتا ہے۔ اُن کے
اخلاق۔ نیکی۔ اور وجاہت کے معانی کی۔
ایک صفت بھی کہاں متحمل ہو سکتی ہے۔ وصاحت
کے لئے ایک وہ ــــــ کہ سالوں تک
کھُل کھیلنے کے باوصف پھر مستطاب
اور عالی جناب کے عالی جناب
ہی رہے۔ اور تہذیب شریعت
شرافت بھُول کر بھی میلی آنکھ سے
اُن کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر
سکی لیکن ایک شمیم تھی ــــــ کم ظرف
اور کوتاہ بخت شمیم کہ وہ ظالم
اب آپ اپنی ہی نگاہوں سے گر کر
رہ گئی تھی۔

گیارھواں خط

جب میں نے پہلی دفعہ لاہور کے لئے خط لکھا تو میرے دل میں پس پردہ
ایک ذاتی غرض پنہاں تھی اور وہ ذاتی غرض تھی۔ ایک ایسی سچی داستانِ الم انگیز
کو منصۂ شہود پر لانے کی جس کو پڑھنے اور سننے کے بعد یقیناً آپ کو اس بازار
کے بڑے بڑے مرکزی اداروں کے ہیڈ کوارٹرز تلاش کرنے میں بہت مدد
ملے گی۔ ایک دفعہ شاید کسی خط میں اشارۃً میں نے اس خواہش کا ذکر بھی کیا۔
لیکن آپ نے اُس کے بعد ہنگامی سوال و جواب ہی میں کچھ ایسا اُلجھا دیا کہ
بات ذہن سے نکل گئی۔ اُس کے بعد انورہ کی وفات نے ذہن و قلب کا سکون
کئی ہفتوں تک متزلزل رکھا۔ آج اتفاق سے انورہ ہی کے تبرکات دیکھتے
بھالتے (آپ انہیں فقط باقیات کا نام دے لیجئے۔ میرے لئے تو اس
گناہ کی چار دیواری میں اس معصوم کی باقیات فی الواقعہ تبرکات سے بھی کہیں
بڑھ کر ہیں) اُس برگشتہ قسمت شمیم کا فوٹو دیکھ کر وہی کسک پھر اپنی پوری
شدت کے ساتھ ٹھوکے دینے لگی ہے۔ اور ایک بولتی ہوئی داستان

ناقابلِ فراموش ہونٹوں کی بلائیں لینے لگی ہے۔

شمیم کا نام سنتے ہی لاہور۔ یا کراچی کی شمیموں اور اُن کے چاہنے والوں کا خون کھولنے لگتا ہے۔ یہ بدنصیب لڑکی اُن سب سے چال ڈھال اور اطوار و آداب میں کاملاً مختلف تھی۔ البتہ اس بھولی بھالی کامنی مورت کا انجام واقعی اتنا ہی ہیبت بلکہ حسرت ناک ہوا۔ جو اس آپ کے بازار کی دوسری بلبلیوں شمیموں کا ہونے والا ہے اُف سے

دل میں اک ہوک اٹھی آنکھ میں آنسو آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

شمیم کی آنکھ اُس چار دیواری میں کُھلی تھی۔ اور بچپن اس مقدس صحن میں گزرا تھا جو مشرقیت کے خلوص۔ شرم و حیا اور غیرت و حجاب کے پرتو کے باعث اڑوس پڑوس کے لئے ہمیشہ لائق صد احترام بنا رہا لیکن فطرت کا عظیم حادثہ کہ اس صحن میں کلیلیں بھرنے والی شمیم اور اُس کے سارے کنبہ کا مقدر ایک ایسی چار دیواری سے وابستہ تھا۔ جس کا باہر کا رنگ تو مشرقی ہی تھا۔ محرابوں کے باہر کی پیشانیوں پر تو آیات ہی کُھدی ہوئی تھیں لیکن اندر ــــ اندر کا رنگ تو شاید انسانی بھی نہ تھا، بلکہ شیطانی کہہ کر بھی آپ اس کی اصل

ہیئت کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے ——— تعلیم دلائی گئی اور خوب دلائی گئی لیکن وہی جس سے ذہن کو جلا ملے۔ روح کی پاکیزہ بالیدگیوں میں اضافہ ہو اور عورت کو رشک صد حور بننے اور کہلانے کے اطوار و آداب سے آگہی عطا ہو اور بس القصہ فطرت کا یہ البیلا شاہکار حسن و نغمہ اور حیا و حجاب کے تقدس میں کچھ اس شان سے بڑھا پھولا۔ کہ اس کی زندگی بخش نکہت نو ہنوں کالوں اور روحوں کو چیرتی ہوئی ایک دن ریاست (؟) کی سب سے اونچی چار دیواریوں تک کو پھاند گئی اور رسوم و تقاریب پہ محض استغنا کی بجائے اب تحفوں اور نذرانوں کے جواب میں باقاعدہ کشتی میں رکھ کر شکریے کے پیغامات آنے جانے لگے

جن میں خاص طور پہ دعائیں شمیسم کے لئے ہوتیں۔

ابھی یہ سلامیوں اور مرادوں کے پہنچنے پہنچانے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مغل بابا کو (شمیم کے والد سارے ہی ریاست میں مغل بابا ہی کے نام سے پکارے جاتے تھے) قضا و قدر کا بلاوا آ گیا اور وہ اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کے بیروہم سے مجبور ہو کر اس نیم نواب گھرانے کو اپنے اکیس سالہ کھلنڈرے اور خاما کار صاحبزادے کے سپرد کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

وہ صاحبزادہ جن کے لئے اب نوابی کی جاگیر کو بحال رکھنے اور متعلقہ کو خاندان کے نگیں رکھنے کے لئے از سر نو خوشامدیں۔ لجاجتیں اور چاپلوسیاں شروع کرنا تھیں۔

قل کے بعد سلطان ساتویں کے بعد اکیسواں اور پھر چالیسواں ان تمام تقاریب میں ریاست کی سب سے بڑی فیملی کا قریبًا ہر بڑا شامل ہوا۔ ہر بالغ۔ ہر جوان نظر باز اور کچھ اس ٹھاٹھ تمکنت اور بدنظری کے ساتھ کہ ان تقریبوں کے تقدس کا کلیجہ پھٹا پھٹ گیا۔ وہی شاہی چونچلے۔ خاص. بردادوں کی پھکٹر بازیاں پھوہڑی پر بھی۔ پچوانوں میں عرق گلاب اور انگاروں پر الائچی دانوں کی افشاں۔ شمیم اور اس کی دادی۔ پرانی تہذیب کی رسیا۔ بہتیری جھنجھلائیں۔ لیکن امیدوار نواب نے ان کی پیش نہ جانے دی اور وہ سب کچھ ہوتا رہا جس کا پھوہڑیوں پر تو ایک طرف تمام شریف گھرانوں کی گھریلو مجلسوں میں. تصور تک بھی کیا نہیں جا سکتا۔ چالیسویں سے اگلے دن صاحبزادے کو شاہی محلوں سے دعوت نامہ پہنچا۔ شمیم اصرار بسیار کے باوصف ساتھ جانے کے لئے آمادہ نہ ہوئی۔ آج زندگی بھر میں پہلا دن تھا کہ شمیم کے ہاں دستر خوان پر کوئی مرد نہ تھا۔ اور خادموں کو حکم

احکام اُسے خود دینے پڑتے تھے۔ اگلے دن بھی عصرانہ بھائی نے شاہی محل کے پائیں باغ ہی میں کیا۔ اور رات گئے لوٹا۔ اس کے بعد تو عصرانے کے بعد غائب ہو جانا اور پو پھٹے گھر لوٹنا گویا اُس کا معمول ہو گیا۔

چند دن تک تو یہ آنا جانا یک طرفہ رہا۔ اور شمیم ہر روز کسی نہ کسی انداز میں اپنی تنہائی اداسی اور ویرانی کا رونا رو دیتی رہی بھولی کہیں کی

"اُسے کیا خبر تھی کہ بھیّا پر رموزِ حرم سوار ہیں۔ اور فرانسیسی ایکٹو پچروں کے بڑ جوڑ پن نے اُسے بے سدھ کر رکھا ہے"۔

اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ باصرار شمیم کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ آج ننھی رانی کی سالگرہ ہے مولود شریف ہو گا۔ قوالی ہو گی۔ سینما کا خاص شو ہو گا۔ پردے کا خاطر خواہ انتظام ہے۔ پردہ داری کا ہزار اہتمام ہے۔ اعلیٰ حضرت ناراض ہو جائیں گے اگر تم نہ گئیں تو اس دعوت سے انکار کفرانِ نعمت جانا جائے گا۔ اور یہ تو تم جانتی ہو وہ ہمارے آقائے ولی نعمت ہیں۔ شمیم مرتی کیا نہ کرتی اوڑھ لپٹ کر ساتھ ہو لی۔ آج بڑی سرکار کے ہاں خاص خاص مہمان تشریف لائے ہوئے تھے۔ ایک ہی قسم کے خون کے خاص خاص مہمان۔ عادات۔ اطوار۔ بد عنوانیوں اور عاقبت نا اندیشی کے نقطۂ نظر سے ایک ہی تھیلی کے چٹے

بٹے۔

"شمیم جنھیں آج تک صرف بزرگ۔ صرف مستقریت کے عظیم ستون اور گنبدوں کا استحکام و احترام جانتی آئی تھی ـــــ آج اُنہی کی نگاہوں باچھوں اور باتوں سے بے غیرتی پھوٹی پڑتی تھی۔"

ہر ایک اپنی اپنی بیٹی۔ بہن اور بیوی کو سجا دھجا کے لایا تھا۔ جانے کس کی ہیرے کی کنی بڑی سرکار کی نظر چڑھ جائے۔ اور اُس کے بھاگ جاگ اُٹھیں۔ وہ سجاوٹ اگاوٹ۔ نئر میلاپن بے وجہ اور بے تکا لجانا۔ اُبھنا۔ اور سمٹنا۔ بس جیسے انتخاب پر چلی آئی ہوں "حسینۂ عالم" کے

کھانا ہوا۔ کھانے کے بعد فنجان بازی ہوئی۔ دُور کہیں مولود شریف بھی ہو رہا تھا شاید۔ کہ حفاظ کے صحیح مخرجوں سے نکالے ہوئے ق اور ع کی کڑک کبھی کبھی سماعت پاشی کرتی تھی، اور اس کے بعد تہہ خانے کے گول کمرے میں سینما کا خاص شو۔ ہر مہمان اپنی آغوش میں ایک ایک گلرخ کو لے کر آرام کرسی پر دراز ہو گیا تو عریاں الیکٹو پکچروں کی باری آئی۔ آج گویا وہ شیطنت کی انتہا دیکھ رہی تھی۔ ہر پوز پر حاضرین جو تاریکی میں گم اور اپنی تاریک روحوں کی بداعمالیوں میں جل ہو چکے تھے ایک فلک شگاف قہقہہ نچھاور کرتے ـــــ شمیم کی تو جیسے

رُوح سمٹ رہی ہو۔ حتیٰ کہ وہ ہوش گنوا بیٹھی۔ اور جب ابتدائی عملی رموز کا سین ختم ہوا اور مقصود نے ہال میں چاندماری شروع کی تو پتہ چلا کہ وہ بیہوش ہو گئی ہے۔ اُس کا سر کرسی کے بائیں بازو پہ سے ڈھلک گیا تھا ——— جیسے دیکھتے ہی ایک آواز آئی۔

اناڑی کہیں کی۔

اور پھر کسی نے یہ مصرعہ الاپا

ادنہ کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

جس کے بعد باقاعدہ ہلڑ بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور شیطنت نے تنگ آکر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

آج کا شو محض شمیم کے باعث ہی بدمزہ رہا تھا۔ وہ شاہی عتاب کی سزاوار تھی۔ بھائی نے عتاب شاہی کے رموز سمجھانے پہ پورے دس دن صرف کئے۔ وہاں دس دنوں میں ہر رات خواب میں متعدد ہال اور متعدد تالیاں اور ان گنت ننگے اور نیم ننگے مردانہ و زنانہ جسم دیکھتی رہی تھی، اور بالآخر اُسے ایک دن خود حرم میں حاضر ہو کر معذرت خواہی پر آمادہ کر لیا گیا

بس وہ گھڑی۔ وہ وقت اور پھر وہ۔ خاموشش بچھڑیوں کے سکھائے ہوئے

جلن۔ بڑے آدمیوں کے دل بھی بڑے ہی وسیع ہوتے ہیں۔ اُن کے ظرف کی گہرائیاں کوئی کس طرح ناپ سکتا ہے ۔ان کے اخلاق ۔نیکی ۔ اور وجاہت کے معانی کی۔ کہاں ایک لغات بھی متحمل ہو سکے گی —— ایک وہ کہ سالوں تک کھُل کھیلنے کے باوصف پھر مستطاب اور عالی جناب کے عالی جناب ہی رہے اور تہذیب شریعت شرافت بھول کر بھی میلی آنکھ سے اُن کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کرسکی ۔لیکن ایک شمیم تھی ۔کم ظرف ۔اور کوتاہ بخت شمیم ۔کہ وہ ظالم آپ اپنی ہی نگاہوں میں گر کر رہ گئی تھی

پھر گھر اجاڑ بھائی نے شاہی سفارشوں سے دو سال بعد سرتاج بھی ڈھونڈ کر دیا تو ایسا کہ جس کی بانکی ادائیں دیکھ کر عورت کو لاج آئے ۔بس سارا دن گلوریاں چبلانے ۔اور آزار بند کی ریشمی گانٹھیں دکھاتے رہنے سے کام دادا جان کے ٹھاٹھ ۔سبحان اللہ ۔ ماموں جان کا محل —— اے ماشاء اللہ اس پہ چچا ابا کے ہاں کی محل سراؤں اور چھیل پائیوں کے تذکرے ۔ بس ادھر شام نازل ہوئی اور اُدھر دہلی بھر کے مشہور و معروف جی حضوریئے اور پٹے آوارہ ہوئے ادھر۔ حضور ہیں کہ بات بات میں گھریلو رنگ آمیزی کے لئے بیگم کا ذکر ٹھونستے چلے جا رہے ہیں ۔ یہ گلوری —— اری کیا

نستعلیق گلوری ہے۔ بیگم ظالم بھی تو کسی ادھ کھلی کلی کو حریری لبادہ پہنا کہ
بھیج دیتی ہیں —— اور یہ چھالیہ جیسے ہیرے کی کنیاں۔ لاکھ سر پٹخا بیگم مرمریں
کونپلیں تھک جائیں گی۔ ان میں حرکت کرتا ہوا خون سہم جائے گا۔ لیکن
اُدھر بس ایک ہی ضد ہے —— آپ کی گلوریوں کی چھالیا تو میرے
ہی ہاتھوں بنیں گی۔ عشائیے سے فراغت ہوتی تو کسی تازہ اُبھرے
کی بنائی ہوئی غزل سنانے بیٹھ جاتے۔ اور درمیان میں ایک آدھ جگہ ٹھٹک
کر یوں اُٹھتے۔ یہ لفظ سانس'

رات شعر کہتے وقت جو ذرا ذہن چونکا تو بیگم نے حضرت خاص شاہی محلات
کی بولی ٹھولی کے کئی حوالے داغ دیئے۔ اور اعلیٰحضرت کی بیاض خاص کے
ایک چھوڑ چار شعر تھما دیئے —— پھر لکھنؤ میں بھی تو مؤنث ہی بولتے ہیں
اسے۔ آہا کیا کوثر میں دھلی ہوئی زبان پائی ہے —— القصہ بانکے نواب نے
اپنی بوالعجبیوں سے اپنے ساتھ اپنی بیگم کی بدنامی بھی چند دنوں میں ساری دہلی
فرمادی —— یہاں تک کہ زبان و بیان کے آثار چڑھاؤ کو نشر کرنے والوں کے
کانوں میں بھی بھنک پڑ گئی اور وہ بھی سازوں اور طنبوروں کی بجائے محض کنٹریکٹ
فارم تھامے آدھمکے —— بس ادھر یہ کسی گھر میں وارد ہوئے۔ اور

اُدھر اُسے رقبائے دوام کو تو مارو گولی، بلکہ کھلی صلائے عام کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اور پھر چند ہی دنوں میں شمیم کی نشیلی گھریلو اور راحت رس ٹپکاتی ہوئی نقرئی آواز عورتوں کے پروگرام میں سنائی دینے لگی۔ پروگرام سے دو گھنٹہ قبل ہی سرکاری کار آکر لے جاتی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ریہرسل ہوتی۔ پھر پروگرام اور اُس کے بعد چاپلوسی، فقرہ بازی اور حفظِ مراتب، نمانازبرداری لیکن شمیم کا کہنا تھا۔

" کہ دہلی اور لکھنؤ کے ان شارع عام قسم کے فن کاروں کی صحبتیں ریاست کی اُن آفاقی صحبتوں سے بدرجہا بہتر تھیں۔ ان میں آرٹ تھا۔ فن تھا۔ جذبات تھے۔ جن کے رنگ و آہنگ میں کبھی کبھی اصل پارٹ بھی ادا ہو جاتا تھا۔ لیکن وہاں تو محض بقیبوں کا ناچ تھا۔ بس بیٹھو — اٹھو۔ فرشی سلام کرو۔ اور چلی جاؤ ...... اگر یہ سب کچھ ٹھیک طریقے سے ہو گیا تو ایک زمانے بھی مہذب معاشرے کی آنکھ کا تارا ہے۔ مولود شریفوں کی صدارت کے لائق ہے ورنہ لائق گردن زدنی ہے عتاب شاہی کی سزاوار ہے اور جاگیر ضبط کئے جانے والوں میں اُس کے خاندان کا نام سرِ فہرست۔"

پھر تقسیم ہو گئی۔ اقتدار بٹ گیا۔ غیرتیں دو لخت ہو گئیں اور عصمتیں دوپاٹ شمیم کے جسم و فن کے سرکاری مداح بھی اُدھر رہ گئے۔ بانکے نواب کی

جان ریڈ کلف کی دو دھاری تلوار پہ نثار ہو گئی —— بات بھی ٹھیک تھی جب گلوری کی سرخی ہی میسر نہ رہی تو اس کی خون کی سرخی پہ بھی لعنت!

"ایک دن محض لکھنوی بانکوں کی طرح مردانیت کے جوش میں آکر اور مسلمانوں پر ظلم ہوتا دیکھ کر ہی تاؤ کھا کر ہیرے کی کنی چاٹ کر جاں بحق ہو گئے"

اور شمیم کناٹ پیلس میں شاپنگ کرتی کرتی ہی کچھ اس طرح اکھڑی کہ کراچی کی بولٹن مارکیٹ پہ آن آنکھ کھلی اس طرح کہ پیٹ میں روٹی۔ نہ جیب میں پیسہ۔ ہاتھ میں پرس ہونا تو ایک طرف —— لیکن یہاں بھاگ گیا۔ خالتو لہیدہ جارہ پروگرام ایگزیکٹو بنے بیٹھے تھے۔ اور چپراسیوں نے ایک ہی رات میں ترقی کر کے اناؤنسروں کی جگہ سنبھال لی تھی —— ایک دن ہر طرف سے دھتکاری ہوئی "سفید پوش الاؤنس" کے لئے درخواست گزرانے گئی تو وکیل نے فیس نہ دیکھ کر جسم کی پیشکش فرمادی اور مستقل نیاز مندی کی درخواست گزار دی۔ اور اس سے اگلی شام ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ ان اجاڑ۔ ویران بارکوں کی طرف۔ راستہ میں اسے ایک شاعر ملا۔ جو تحت اللفظ پڑھنے میں مہارتِ تامہ رکھتا تھا اور محض اسی طرح پڑھتے

پڑھتے ہی ایکٹروں کی صف میں آگھسا تھا، اس نے اُسے لاہور کی ایک نہایت ہی روشن مستقبل والی فلم کمپنی کے قیام کی خبر سنائی ——

تم ہیروئن بنو گی

تم آسمان شہرت پر آفتاب بن کر چمک سکو گی

تم کلو پیٹرا خصائل ہو۔

تم حور شمائل ہو۔

تم چہکو گی، تو فطرت کے زمزمے اپنی چوکڑی بھول جائیں گے۔

تم آواز اٹھاؤ گی تو لحن داؤدی کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔

تم لب ہائے لعلیں کو جنبش دو گی تو اہمیّ عز الّم کا دل ڈھل جائے گا۔

القصہ اس بہروپئے نے ادب اور رنگدکاری کا کچھ ایسا دام پھیلایا کر بھولی شمیم بے بس ہو چارہ شمیم اس میں اُلجھ کر رہ گئی،

لاہور کے بڑے آفس میں پہنچی تو پروڈیوسر سے نیاز مندانہ ملاقات کے بعد سب سے پہلا کام اُس کے مختلف زاویوں سے فوٹو اتروانے کا تھا۔

چنانچہ میک اپ ڈائرکٹر نے کوئی دس دفعہ لباس پہنوایا اور اتروایا ہر دفعہ یہ گاؤن اور ساڑھیاں مردہی زیب تن کرواتے تھے۔ قد آدم شیشے کے

سامنے کھڑا کرکے جن کی متوحش آنکھوں سے ہڑکائے درندوں کی سی

اشتہا برس رہی تھی۔

جب وہ جسم کا انگ انگ جانچ چکے، چھو چکے بلکہ یوں کہیئے کہ چکھ چکے

تو فوٹو گرافر کی باری آئی ——— کبھی وہ ٹھوڑی کو ذرا اوپر اٹھاتا۔ کبھی اپنی انگلیاں

عارضوں پر رکھ کر چہرے کو کسی خاص زاویے پر فٹ کرتا۔ کبھی کندھوں کا پوز

بناتے وقت جسم سے بے نیازی بے نیازی ہی میں کھیل جاتا۔ آپ کا یہ گوشہ

بھاری ہے۔ بس ادھر سے ذرا سمٹ جائیے۔ تصویر جاندار اترے گی۔ گویا

فوٹو گرافر کا ہاتھ جسم کے ہر حصہ کے سڈول پن کا جائزہ لیتا رہا۔ نگاہوں میں ذرا

مستی بھریئے۔ بس اس طرح کہ محبت بھرا دل امڈ کر آنکھوں میں آجائے۔

میری طرف دیکھ کر

مجھ سے آنکھ ملا کر

یوں سمجھئے کہ (خوش قسمتی سے) اس وقت ان محبت بھری

نگاہوں کا مرکز میں ہی ہوں۔

گویا پہلے دن ابتدائی کم سوادوں کی بھینٹ چڑھی۔ اگلے دن تین سو

روپے ماہوار کا معاہدہ ہوا۔ لیکن یہ تین سو روپے تو ملنے شروع ہوں گے

اُس دن سے جس دن وہ سیٹ پر جائے گی۔ فی الحال تو صرف پچاس روپے ہی ایڈوانس مل سکتے ہیں۔

ہیروئن کا پارٹ لکھوا دیا گیا اب ساتھی آرٹسٹ یعنی فلمی ہتھکنڈے اُس سے کرید کرید کر باتیں دریافت کرنے لگے لیکن ابھی ہیروئن کے تقرر کی تصدیق باقی تھی۔ چنانچہ اُسے ڈائرکٹر ول کے پاس باہر بھجوا دیا گیا۔ ان ملاقاتوں میں جو جو کچھ اُس سے مذاکرہ کیا گیا اس پر پروڈیوسر بار بار اُس نتیجے پر کا کہنا تھا۔ اس سے کمپنی کا نام بدنام ہو جائے گا۔ لیکن پھر جلد ہی ایک دن ایسا بھی آیا کہ انہوں نے خود بھی اس بدنامی کو بالائے طاق رکھ دیا۔

شبنم کو اپنا پارٹ یاد ہو کر بھول بھی گیا تھا۔ لیکن سیٹ پر کام شروع ہونے ہی میں نہ آتا تھا ایڈوانس ختم ہو چکا تھا۔ اور اب اُدھار مستعار بلکہ ہلکے پھلکے دیو پار پر گزر ہونے لگی تھی۔ ایک دن تو تنگ آکر اُس نے پروڈیوسر سے دریافت کر ہی لیا۔

کام کب شروع ہوگا آخر؟

اور اُس نے ہنس کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ساتھی سے کہہ دیا

"بتاؤ بھی! انہیں کام کب شروع ہوگا آخر" اور پھر خود ہی یوں گویا ہوا۔

"لیکن آپ کو کام کی ضرورت بھی کیا ہے؟

تو گویا آپ کام کرنے آئی تھیں یہاں؟"

یہ نقاب کچھ ادھر کا تو شمیم نے صاف دیکھ لیا کہ اس کمپنی جیسی دس بیس

اور بھی کمپنیاں اُس کے پڑوس میں بکھری پڑی ہیں۔

جن کا کام بھی شاید کبھی شروع نہ ہوگا۔

اس انکشاف و آگہی سے متاثر ہو کر وہ لاہور کو خیرباد کہہ کر پھر کراچی آ گئی۔

ایک نئی فلم کمپنی کا اشتہار دیکھ کر۔ جس پہ اکابرِ حکومت کی سرپرستی کا الزام

تھا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک عظیم فن کار سے ہوئی۔ "پاکستان کا وہ مایۂ ناز

فن کار جس نے اُسے آتشک کے کوڑھ سے نوازا اور جس کے عطا کردہ

لاوے کی لپیٹ ہی میں آ کر ایک دن شمیم نے اپنی جان جانِ آفرین کے

سپرد کر دی"۔

میں سیر سے آ رہی تھی۔ جونہی میری وکٹوریہ کوٹری کے بڑے پُل پہ

پہنچی۔ میں نے دیکھا ایک عورت پایاب پانی میں ڈوبنے کی ناکام کوشش

کر رہی تھی۔ وہ بچے طرح غوطے لگا رہی تھی۔ کبھی خود کو پانی کے سپُرد

کر دیتی تھی۔ کبھی کانوں میں انگلیاں ٹھونسے بغیر پانی میں اپنا اگلا دھڑ ڈبو دیتی تھی۔ گویا ڈوب جانا چاہتی تھی۔ لیکن ڈوب نہ پاتی تھی۔ ہم وکٹوریہ پُل کے دوسری طرف کھڑی کر کے اُس کے قریب پہنچے تو وہ ہلکان ہو چکی تھی۔ اُسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ چیخنے لگی۔

"مجھے نہ پکڑو۔ مجھے نہ بچاؤ۔ مجھے آتشک ہے۔ تم بھی بیمار ہو جاؤ گے اور پھر تم بھی ایک دن میری طرح ڈوبنا چاہو گے۔ مجھے مر جانے دو میرا مر جانا اس زندہ رہنے سے اچھا ہے!"

لیکن صد شکر کہ سندھ کی طغیانیاں ریت میں دفن تھیں اور ڈرائیور نے پانی میں اس کے پیچھے بھاگ کر اُسے دبوچ ہی لیا، اور میری دعا قبول ہو گئی۔ اور میں اس زندگی کی ہاری ہوئی شبنم کو وکٹوریہ میں ڈال کر اپنے ہاں لے آئی۔

چاند سا چہرہ۔ گداز اور سڈول جسم۔ صراحی دار بلوریں گردن۔ شیشہ سی نیلم پری کی سی آنکھیں۔ سنہرے گھنگھریالے بال۔ سچ مچ ہیروئن۔ لیکن جسم کا بیشتر حصہ خونچکاں تھا۔ زخموں سے پیپ بہہ رہی تھی۔ گویا محنت کے بعد ہیروئن کے مسام خون چھوڑ رہے تھے۔ میں نے مقدور بھر

اُس کا علاج کروایا۔ بھابی نے تو دن رات اُس کی خدمت کی اور ننھے انور کی تو اُسے "بڑی باجی" کہتے کہتے زبان خشک ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ خود بھی جانبر نہ ہونا چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ اکثر زخم کو بید دیتی۔ دوائی انڈیل دیتی۔ پھاہے اُتار کر ان پر مکھیوں کو بھنبھنانے کی دعوت دیتی۔ القصہ اُسے زندہ نہ رہنا تھا۔ نہ رہ سکی —— اور آج میرے پاس صرف اُس کی تصویر باقی ہے۔ وہ تصویر جو کفن میں لپٹا کر اتروائی گئی تھی۔

"دیکھئے تو جیسے ایک پری اپنے مرمریں جسم کو اپنے پروں میں سمیٹے لیٹی ہوئی ہو"

یہ تصویر انور عموماً اپنے جزدان میں رکھتا تھا۔ آج جو اُس کی کتابوں۔ کاپیوں کا جائزہ لے کر اس کے ننھے منّھے قلمی نقوش سے آنکھوں کو سیراب کرنے کے لئے اُس کا جزدان کھولا تو اُس کے اُردو کے نصاب میں سے شمیم کا فوٹو نکل آیا۔ فوٹو کے علاوہ اُس کی دوسری چیز میرے سینے میں جاگزیں اُس کی یہ داستان الم انگیز تھی جسے آپ کے سپرد کر رہی ہوں۔ شاید اُس کی روشنی میں آپ کا قلم کبھی اس بازار کے ان بڑے بڑے اداروں کی طرف بھی جھانک سکے۔ (ن۔ ج۔ گ)

کون زحمت گوارا کرتا پھرے گا کہ اتنے

تجسّس کی کہ دُکھیاری۔ ز۔ س۔ ج۔ گ۔

نے یہ درد بھرے ساز کیوں چھیڑے تھے۔

بلکہ اُنہیں ترتیب سے چھیڑنے کی

بجائے ایک دم اضطراب کے ساتھ

جھنجھنانا ہی کیوں شروع کر دیا تھا۔ اُس نے

اور آپ نے جو اتنی مغز پچی کی تو بھلا کیوں

اور کس لئے لکھنے کے لئے موضوع

بھلا ادھر کم تھے کیا — اور اگر بالفرض مقصود

برداشت کتاب کی مشق ہی تھی تو پھر ذرا

کھُل کر ہی ان قندیلوں پر بانس مارا ہوتا۔ یہ

کیا کہ کچھ کہے بھی دے رہے ہیں اور سہلا

بھی رہے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے بھی ہیں۔

لیکن کہہ بھی نہیں پاتے ع

صاف چھُپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

بارھواں خط

خیر حضرت یہ بھی خوب رہی کہ اگر میں نے درد کی نشان دہی اور مرض کی تشخیص کی ہے تو اس کا علاج بھی اب میں ہی عرض کروں۔ اور جو کام دراصل آپ ایسے مدیرانِ شہیر، علمائے بے بدل اور فضلائے اجل کا ہے اُسے بھی اب میں یعنی "ایک سیہ کار عورت" جو سیہ طوائف ہی انجام دے اور ابھی اس پر آپ کو سنجیدگی کے ساتھ اصرار ہوگا کہ آپ فی الواقعہ دل لگی نہیں فرما رہے ——— حضور میں نہ ناصح، نہ زاہد، نہ امیرِ شریعت اور نہ فقیہہ مشرق اور نہ کچھ اور بلکہ در

صرف اور صرف ایک عورت ہوں، جسے معاشرہ کی کم سوادیت نے اب عورت بھی نہیں رہنے دیا۔ جانے آپ کے ذہن کو کس خوش فہمی نے کھجلانا شروع کیا ہے کہ اب آپ بھی مجھے اِس بازار کی اجلی خاں سمجھنے لگے ہیں"

——— ایسی بے بس مجبور عورت جو خواہش کے باوجود آج تک اپنے معاشرتی کاج نہ سنوار سکی!

"بھلا بتائیے تو اتنی لمبی اور مسلسل جدوجہد کے بعد میں نے اپنے
مقدر کی کون سی شکن دُور کر لی ہے جس سے متاثر ہو کر آپ میرے
بتائے ہوئے گُرُوں کو نسخۂ شافی کا درجہ دینے پر آمادہ ہو رہے
ہیں ــــ

پھر ہمارا سماج ۔ ہمارا ماحول ۔ اُس کے ارکان ۔ اُس کی زینت ۔
حتیٰ کہ آپ اور میں سب وہی تو ہیں ــــ باقی رہی یہ چرب زبانی
اور یہ بک جھک جو میں اور آپ باجماعت فرماتے رہے ہیں ، تو
اُس کا فائدہ معلوم ؟ ــــ کون زحمت گوارا کرتا پھرے گا ۔ اتنے
تجسّس کی کر ز ۔ ح ۔ گ نے یہ درد بھلے ساز کیوں چھیڑے تھے ۔ بلکہ
انہیں ترتیب سے چھیڑنے کی بجائے ایک دم اضطراب کے ساتھ
جھنجھنا نا سی کیوں شروع کر دیا تھا اُس نے ــــ اور آپ نے جو اتنی مغز
پچی کی تو بھلا کیوں اور کس لئے ۔ لکھنے کے لئے موضوع اور بھلا کم تھے
کیا ؟ اور اگر بالفرض مقصود برداشت عتاب کی مشق ہی تھی تو پھر ذرا کھُل
کر ہی ان قندیلوں پر بانس مارا ہوتا ۔

یہ کیا کہ کچوکے بھی دے رہے ہیں اور سہلا بھی رہے ہیں ۔ کچھ کہنا

چاہتے بھی ہیں لیکن کہہ بھی نہیں پاتے ع

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

حضور اس طرزِ فغاں کے رسیا کان۔ ذہن اور دل اللہ کو پیارے ہو چکے۔ طنز و مزاح کا وارد کارگر ہوتا ہے۔ لطیف ذہنوں کے لئے مگر آج وہ لطافت اس گھناونے گرد و پیش میں بھلا کیوں؟

کیا آپ کو اس کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں کہیں؟

ویسے بکنے پر آ گئی تو میں آپ کی اس فرمائش کی تعمیل میں بھی کچھ نہ کچھ واہی تباہی بک ہی جاؤں گی۔ مگر یہ سب کچھ ہوگا کیسا۔ محض ایک زخمی سانپ کی پھنکار اور بس لیکن اس پھنکار کے زہر سے نشہ نچوڑنے سے پیشتر آپ مجھ سے وعدہ کریں گے کہ کل کلاں کو آپ کی شریعت۔ آپ کا ضابطۂ اخلاق اور آپ کا لچکدار قانون میرے آڑے نہ آئے گا۔ میرے درپے نہ ہوگا۔ اور میرا مستقبل ان کے انتقام کی نذر نہ ہو جائے گا —— گو یہ علاج۔ یہ نسخہ شافی اور اس کاٹے کا یہ مار و اور منتر بتانے سے پیشتر ہی میں یقین ہی نہیں۔ وثوق رکھتی ہوں کہ یہ فقط ساحل ہی سے رزم خیر و شر کا لطف اٹھانے والی طبائع

کو کبھی راس نہیں آسکے گا۔

اصل بات یہ ہے کہ مرد وہ شکاری ہے۔ وہ سفلہ شکاری جو پیٹ بھر لینے کے بعد شکار کے لئے نکلتا ہے۔ عام حیوانوں۔ چرندوں، اور درندوں سے برعکس جو جب اِدھر اُدھر سے مار دھاڑ کر لیتے ہیں تو مطمئن ہو کر تھان پر آ بیٹھتے ہیں۔

یہ سفلہ شکاری گھر میں دو دو بیویاں ہوتے ہوئے، پوری طرح سیر ہونے کے باوجود بدرووں میں سونگھتے پھرنے کے لئے نکلتا ہے۔ آپ ایسے درندے کے لئے قواعد و ضوابط ڈھونڈنے نکلے ہیں آپ بھی کتنے بھولے ہیں"۔

مرد کی فطرت میں عورت کی نسبت زیادہ اوباشن پن اور جارحیت موجود ہے۔ یہ اوباش پن اور چھیننے کی سرشت قریباً قریباً ہر جانداروں میں موجود ہے۔ مرغوں سے لے کر بھینسوں تک یہ ایک ایسی مشین ہے جس کے ذہن میں یونہی اشتہا کی ہوا بھرتی ہے۔ آٹومیٹک مشین کی طرح چلنا شروع کر دیتی ہے۔ ماحول کو نظر انداز کر کے۔ بلند و پست۔ اچھے اور بُرے کی تمیز سے بے نیاز

ہو کر اسی باعث یہ اوباش عورتوں کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے۔ اس
کے برعکس عورت فطرتاً اوباش پن کی نسبت شرافت سے زیادہ مرعوب ہوتی
ہے۔ بلکہ اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں کہنے کی جرأت کروں۔ کہ آپ
کے اس بازار میں تو عورت لائی ہی اسی فریب کے بل پہ جاتی ہے
حتیٰ کہ وہ اس بازار میں بھی ہاں لائسنس یافتہ کوٹھوں میں بھی ان
درندوں کے پہلو میں بیٹھنے کی جرأت نہیں کرتی۔ جب تک
اُسے اُس کے محافظ یہ یقین نہ دلادیں کہ

"نو وارد ایک بہت بڑا خاندانی اور شریف آدمی ہے"

عورت فنونِ لطیفہ میں سے ہے۔ فن لطیف بلکہ خود فی الواقعہ
صنفِ لطیف ہے۔ اور مرد محض تماش بین۔ وہ نظارہ باز ہے۔
نظارہ کرتا رہتا ہے، اور جب اس سے سیر ہو چکتا ہے تو
تو پہلے منظر کو توڑ مروڑ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔ ذہن کی
طرح اُس کی روح۔ جسم اور قلب ہر موڑ پہ اپنے اپنے منہ
مزہ بدلتے رہنے کے عادی ہیں۔ اس پہ ایک ایسا مرد جو
صدیوں غلام رہا ہو جس کی مردانیت کے جوہر حکومت نے

زنگ آلود کر دیئے ہوں۔ جس کے آفاقی اوصاف خوشامدوں چاپلوسیوں اور لجاجتوں کی نذر ہو گئے ہوں۔ خدا بچائے اس مہذب کرم خوردہ مردے سے ـــــ لیکن اس کے باوجود میرا اپنا بھی یہی گمان ہے کہ فی الحال اس کا مرض لاعلاج نہیں۔ گو پرانا ضرور ہے اور لازماً اسے رو بصحت ہونے میں ذرا دیر بھی لگے گی۔ اس کا علاج کر سکتی ہے ـــــ آپ کی حکومت۔ اور اس حکومت میں سے بھی اس کے وہ ارکان جو "اس بازار" کے کسی ادارہ کے در پردہ سرپرست یا کفیل نہیں ہیں۔

آپ کے سماج کا وہ بے خبر۔ رجعت پسند اور آپ کی نظر میں پس ماندہ عنصر جو ابھی تک کسی نہ کسی مجبوری کے باعث اس بازار سے دور رہا ہے۔

اور آپ۔ جن کے ہاتھ میں قوموں کے ذہنوں کی باگ ڈور ہے۔ "اس آپ" سے "میری مراد صحافی بھی ہیں شاعر بھی اور ادیب بھی۔

"خدا جانے شاعروں نے قوموں کو بگاڑنے کا کلم کیوں سنبھال

لیا ہے حالانکہ تاریخ نے ان کے ماتھے پر قوموں کی تعمیر کا سہرا باندھا تھا۔"

مجھے اپنے معاشرے سے جو شکوہ ہے وہی شکوہ آپ کے خط کے جواب میں آپ سے دُہرانا چاہتی ہوں۔

حضورِ انور! آپ اپنا پارٹ بھی مجھ ہی سے کیوں ادا کرانا چاہتے ہیں۔ میرا کام تھا کریدنا۔ جسم کے ناسوروں پر سے سڑی ہوئی جھلی اتار دینا۔ باقی رہی یہ بات کہ اس گندے مواد کو باہر پھینکا جائے اور اندمالِ زخم کی تدابیر عمل میں لائی جائیں ——— اس کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کر سکتی ——— کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں اور نہ مجھے اس کوچہ سے کوئی آشنائی ہی ہے۔

معاشرہ کی اوپر والی سطح پر جو ناانصافیاں اور جھوٹے ملمعے ہیں وہ تو آپ کو بھی نظر آ رہے تھے۔ اندرون کی نشان دہی میں نے کر دی ——— اب رہا اس کا علاج! میرا اتنی صلاحیتوں والا دماغ تو اس قدر بے بس ——— لاغر اور جکڑا ہوا ہے۔ کہ اب تک اس متعفن چار دیواری سے مکمل خلاصی نہیں کرا سکا۔ آپ مجھے ساری

قوم اور سارے ملک کا ٹھیکہ دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات ہے بھی سچ —— بھلا ایک طوائف کیا جانے۔

- اقتصادی و معاشی نا پائیداری کو دُور کرنے کے لئے کہاں کہاں ٹھوس عملی اقدام کی ضرورت ہے۔ اور کہاں فقط آیات کی تلاوت ہی کی۔
- یہ جوہر بھنگی۔ چاپلوس۔ جبشی دلال اور کیمرہ بردار پروڈیوسروں — کلاکاروں اور ہدایت کاروں کا لباس پہنے پھر رہا ہے۔ یہ محض تلقین سے کہاں تک اپنا اصل روپ دھار لے گا۔ اور حکومت کی سنگین سرزنش کی کس حد تک ضرورت پڑے گی۔
- مجھے کیا معلوم کہ تعلیم، حفظانِ صحت اور فلم جیسے مفید اور تربیتی ادارے جو اُس نے محض خاندانی تفریحی آدمیوں کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اس میں اس کی کون سی ذاتی ارتقائی مصلحت مضمر ہے۔
- میں کیسے یہ یقین کر لوں کہ ہمارے قانون اور ہمارے انصاف کی بے بسی آپ کو نظر نہیں آ رہی کہ وہ ایک سچی اور اظہر من الشمس بات کو سچا قرار دینے کے لئے ابھی تک جھوٹی شہادتوں کا محتاج ہے۔

• اور پھر یہ ـــــ کہ آپ ایک طوائف کی یہ بات واقعی مان جائیں گے کہ اسلام نے جو مسلمان کے لئے چار شادیوں کی اجازت رکھی تھی وہ دراصل انہی بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے ہی تھی۔ اگر آپ کے سفلہ جذبات کی تسکین ادھر اُدھر جھک مارے بغیر نہیں ہو سکتی تو براہِ کرم اسی طرف رجوع فرمائیے۔

اور پھر ستم تو یہ ہے کہ مجھے صرف ایک ہی طریق سے گفتگو کرنی آتی ہے۔ میں کسی خاص زمرے کو خطاب کر سکتی ہوں۔ اس کے مرغوب و پسندیدہ انداز میں بھی ـــــ لیکن اس شرط پر کہ مجھے پہلے یقین دلا دیا جائے کہ اس میں سب ایک ہی معیار ایک ہی صفات اور ایک ہی خون کے لوگ ہوں گے۔ یہ سب صحافی ہوں گے۔ سب کے سب شاعر۔ سارے کے سارے نجیب الطرفین۔ یا پھر سب کے سب طوائف زادے۔ لیکن آپ نے تو اب کچھ ایسا گھپلا سا مچا رکھا ہے کہ ملک زادہ۔ نواب زادہ اور طوائف زادہ میں کوئی ایسی امتیازی بات رہی ہی نہیں کہ پہچانا جا سکے ـــــ کم از کم چہروں کی تزئین و ہیئت لباس وضع قطع اور چال ڈھال کے لحاظ سے تو آپ نے

ذرّہ بھر فرق نہیں رہنے دیا —— حضور! مجھے ابھی تک کسی باوٹے کتے نے نہیں کاٹا کہ —— میں ان شریفوں سے اپنی فضیحتی کراؤں۔ انہی کے ہاتھوں سے جو ہماری حیات ہماری زلبیت اور راحت کے ہر لمحہ کی آرائش وزیبائش کے ضامن اور ذمہ دار ہیں —— ورنہ اگر خدانخواستہ میرے اس بڑبولے مُنہ کی باتوں سے تاؤ کھا کر ان توندوں۔ اچکنوں۔ کھڑاؤں۔ پتلونوں اور کاروں نے ہمیں بھی یرغمال بنا کر ہماری ہزاروں دوسری بہنوں کی طرح سرحد پار دھکیل دیا تو؟ —— پھر ہم تو کہیں کی نہیں رہیں گی۔ اے میرے حضور!

یہ کام آپ کا ہے۔ آپ ہی کو زیب دیتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے اگر آپ نے اس دشوار گزار مرحلہ کو سر کرنے کا بیڑا اٹھا لیا تو جلد یا بدیر آپ کو اپنے ہمنوا بھی کسی قدر مل ہی جائیں گے —— بس بسم اللہ پڑھ کر شروع کر دیجئے میں دعا مانگوں گی کہ میرا خدا آپ کو وہ دلدوز سویرا ابھرتا دیکھنے تک کے لئے زندہ رکھے:-

(ز - ج - گ)

اگر آپ نے اس دشوار گذار مرحلہ کو سر کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا تو جلد یا بدیر آپ کو اپنے ہمنوا بھی کسی قدر مل ہی جائیں گے ——— بس بسم اللہ پڑھ کر شروع کر دیجئے۔ میں دعا مانگوں گی کہ میرا خدا مجھے وہ دلدوز سویرا اُبھرنا دیکھنے تک کے لئے زندہ رکھے +

(ز ج ۔ گ)

اُردُو اکیڈمی

لوہاری دروازہ

لاہور

قابل قدر کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
ڈاک گھر	رفیق غازی	۱۲ار	ہتّارانا یارو داری	کیفی	۶
مراری دادا		۴ر	پریم ترنگنی	٫٫	۴ر
بانگ درا	ڈاکٹر محمد اقبال	صہ	راج دلاری	٫٫	۸ر
بال جبریل	٫٫ مجلد	للعہ	فریاد امت	اقبال	۴ر
ضرب کلیم	٫٫	٫٫ سے	شکوہ	٫٫	۸ر
اسرار رموز	٫٫	٫٫ للعہ	طلوع اسلام	٫٫	۶ر
پیام مشرق	٫٫	٫٫ للعہ	خضر راہ	٫٫	۴ر
زبور عجم	٫٫	للعہ	مکاتیب اقبال		۸ر
جاوید نامہ	٫٫	صر	ارشادات اقبال		۶ر
پس چہ باید کرد	٫٫	۸ر	حرف اقبال		سے
ارمغان حجاز	٫٫	للعہ	اقبال کے چند جواہر ریزے		۱۰ر
فلسفۂ عجم	مترجمہ میر حسن دین	۲ر	تعلیمات اقبال	سلیم چشتی	۸ر
نالۂ یتیم		۳ر	روح اقبال	یوسف حسین خاں	۱۲ر

ملنے کا پتہ:- اُردو اکیڈمی۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور

(مکتبۂ محمد شریف تاجپورہ لاہور)

